مقالات

# حصن المسلم

جلد ہفتم

مؤلف
ندیم ایاز

مکتبہ دار الرحیل

**کتاب: حصن المسلم کے مقالات جلدہفتم**
**مولف: ندیم ایاز**
**سال اشاعت: 2021**
**قیمت: 250روپیہ**

فہرست

0.....

**مقدمہ** .....3

**تالیفات.....4**

**(1) آزادی اظہارِ رائے کی حقیقت .....6**

**(2) مسئلہ تکفیر کب فتنہ ِ تکفیر بنتا ہے** .....16

**(3) فتنہ وحدت ادیان** .....33

**(4) مسئلہ تکفیر اور اُس کے بھیانک نتائج**.....50

**(5) شخصی آزادی کا صحیح مفہوم**.....61

**(6) تصویر کشی ایک گھناؤنا جرم جسے بہت ارزاں سمجھ لیا گیاہے ۔**.....66

**(7) الحاد کا مفہوم** .....74

**(8) آزادئ اظہارِ رائےکے شرعی اصول وضوابط**.....85

**(9) اجازت لینے سے متعلق شرعی آداب اور حکمتیں!** .....109

**(10) انکارِ حدیث کا مطلب اور منکر حدیث کا مصداق کون؟**.....139

**(11) حقوقِ نسواں ! عورت کے ساتھ حسن معاشرت کی تاکید**.....152

**(12) شعائر ِدین کا مذاق ایک سنگین جرم اور ہمارےمعاشرے میں اس کی مروّجہ صورتیں!** .....231

## مقدمہ

**الحمد للہ، اصلاحی سلسلے کی یہ ایک اور بہترین کتاب ہے ۔ جہاں دکھ اور مصیبتیں بڑھ گئیں ہیں وہاں ایمان کو جلا بخشنے کے لئے قرآن وسنت کی روشنی ایک بہترین ذریعہ ہے، ثابت قدم ہیں وہ لوگ ہر دکھ، خوف اور پریشانی میں جن کو لا الہ الا اللہ نے مضبوط کردیا ہے ۔**
**کسی کے دل میں سرور اور خوشی کا إحساس ڈال دینا ایک أفضل عبادت ہے آپ کے دکھ کم کرنے میں یہ میری استطاعت میں ہے کہ کلمہ خیر آپ کے سامنے رکھوں اللہ تعالیٰ مجھے مزید توفیق عطا فرمائے آمین**

**قاری شیخ ندیم ایاز حفظہ اللہ تعالیٰ**
**16نومبر 2021 کراچی**
**whatsapp 00923172134743**
**Peaceofmindna.com website**
**Peaceofmind.na facebook page**

## تالیفات

**(1) قرآنی دعائیں**
**(2) اللہ کے بندے مادہ پرست نہیں ہوتے**
**(3) اصلاح النساء**
**(4) طرق التفسیر**
**(5) قرآن مجید کی تفسیر کے اقسام**
**(6) المناهج المختلفة للمفسرين**
**(7) الكبائر التي ذكرها الإمام الذهبي**
**(8) اسلام سائنس اور الحاد**
**(9) ملحدین کے پچاس اعتراضات کے جوابات**
**(10) ملحدین کی اصلاح**
**(11) خدا کے بارے میں ملحدین کی پریشانی کا علاج**
**(12) پاکستان میں اسلامی دستور کے لیے علماء کے 22 متفقہ نکات**
**(13) أسهل طريقة لحفظ القرآن الكريم**
**(14) صحیفہ ہمام بن منبہ**
**(15) المعجم الصغير للطبرانی**
**(16) پیغام مدینہ جلد اول**
**(17) پیغام مدینہ جلد دوم**
**(18) پیغام مدینہ جلد سوم**
**(19) پیغام مدینہ جلد چہارم**
**(20) پیغام مدینہ جلد پنجم**
**(21) پیغام مدینہ جلد ششم**
**(22) پیغام مکہ جلد اول**
**(23) مقالات حصن المسلم جلد اول**
**(24) مقالات سیرت جلد اول**
**(25) مقالات سیرت جلد دوم**
**(26) مقالات سیرت جلد سوم**
**(27) مقالات حصن المسلم جلد دوم**

**(28) مقالات حصن المسلم جلد سوم**
**(29) مقالات حصن المسلم جلدچهارم**
**(30) مقالات حصن المسلم جلد پنجم**
**(31) مقالات حصن المسلم جلد ششم**
**(32) مقالات حصن المسلم جلدهفتم**
**(33) مقالات حصن المسلم جلد هشتم**
**(34) بے قرار دل کا قرار**

## (1) آزادی اظہارِ رائے کی حقیقت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمہ اللہ وبرکاتہ۔۔۔وبعد!۔

گستاخان یورپ گاہے گاہے کائنات کی سب سے عظیم ہستی کی شان اقدس میں گستاخی کی جارت کرکے دنیا میں سب سے زیادہ بسنے والے مسلمانوں کی دل آزاری کرتے ہیں اور پھر اس کو آزادئ اظہار رائے کے نام پر جاری رکھنے پر اصرار بھی کرتے ہیں حالانکہ رائے کی آزادی اور کسی کی دل آزاری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

دنیا کے کسی معاشرے میں رائے کے اظہار کی ایسی آزادی نہیں کہ جس کی چاہا عزت خاک میں ملادی اور جس کے چاہا دل کے پرخچے اڑادیئے۔ ہر معاشرے نے اپنے اپنے حالات کے مطابق اظہار رائے کی حدود مقرر کی ہیں حقائق تک کو بیان کرنے کے لئے بھی حدود وقیود پائی جاتی ہیں مثلاً یورپ وامریکہ میں بھی جہاں فحاشی وعریانی عروج پر ہے بچوں میں جنسی ہیجان پیدا کرنے والی فحش نگاری، مذہبی ونسلی منافرت پھیلانے والی تحاریر وتقاریر پر پابندی ہے۔ آسٹریا، بیلجیئم، چیک ری پبلکن، فرانس، جرمنی، اسرائیل، ایتھوپیا، پولینڈ، رومانیہ، چیکوسلواکیہ، سوئزرلینڈ وغیرہ میں عالمی جنگوں کی تباہی کے انکار کو فوجداری جرم قرار دیا گیا ہے۔ یورپ کے اکثر ممالک میں ہولوکاسٹ کے انکار بلکہ اس کے بارے میں یہ تک کہنے کی اجازت نہیں کے اس میں ہلاک شدہ یہودیوں کی تعداد مبالغہ آمیز ہے۔

۱۹۸۴ء میں ایک اسکول ٹیچر جیمز کنگ نے ہولوکاسٹ کے بارے میں چند الفاظ کہے تھے اس کو نوکری سے برخاست کرکے سزا دی گئی، کینیڈا کے ارنسٹ رنڈل کو

ہولوکاسٹ کے بارے میں تضحیکی انداز اپنانے پر پندرہ ماہ کی قید کی سزا ہوئی اور کینیڈا ہی کے کن میک وے کو انٹرنیٹ پر مضمون لکھنے پر جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ آسٹریا کے ایک لکھاری ڈیوڈ ڈارونگ نے لکھا کہ ساٹھ لاکھ یہودیوں کی ہلاکت مبالغہ آمیز ہے اس کو سترہ سال بعد (فروری ۲۰۰۶ء میں) گرفتار کر کے تین سال کی سزا دی گئی۔

ایران کے صدر احمد نژاد نے ہولوکاسٹ کے بارے میں تقریر کی تو پورے یورپ نے شدید احتجاج کیا تھا۔ یورپ کے بعض ممالک میں ہولوکاسٹ کے انکار پر ۲۰ سال تک کی سزا مقرر ہے۔ ایرانی صدر احمدی نژاد کی تقریر پر یہودی تنظیم کے صدر کا بیان شائع ہوا تھا کے ہولوکاسٹ کے انکار کا مطلب ۶۰ لاکھ یہودیوں کو دوبارہ قتل کرنے کے مترادف ہے۔

اظہار رائے کی آزادی کی بات کرنے والے یورپ و امریکہ کی اپنی حالت یہ ہے کے وہاں بھی کوئی کھل کر ان کے دستور، اقتدار اعلیٰ یا پالیسیوں پر بات نہیں کر سکتا صرف یورپ و امریکہ کیا؟۔ پوری دنیا میں ہتک عزت، توہین عدالت کے قوانین موجود ہیں دنیا کے ہر ملک میں وہاں کے دستور یا اقتدار اعلیٰ سے بغاوت یا باعیانہ اظہار رائے کو سنگین جرم قرار دیا گیا ہے اور مجرموں کے لئے موت تک کی سزا موجود ہے۔ اسی طرح مقدس ہستیوں، مقدس مقامات، اور مقدس اشیاء، کو توہین پر سزا کا قانون بھی اکثر (بلکہ تمام) ممالک میں موجود ہے۔

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے مطابق اکثر ممالک میں بلاس فمی لاء BLAS APHEMY LAW ایک لفظ موجود ہے۔ خصوصا آسمانی صحائف اور آسمانی ادیان سے تعلق رکھنے والی اقوام میں انبیاء و رسل کی توہین قابل سزا جرم ہے۔ قدیم ایران میں تین قسم کے جرم تھے:

۱۔ اللہ کے خلاف۔

۲۔ بادشاہ کے خلاف۔

۳۔ انسانوں کے ایک دوسرے کے خلاف۔

ہندومت میں ستیارتھ پرکاش (چمپوتی ۷۱-۷۱) صفحہ ۲۹۷ کے مطابق ناسٹک (مذہب بیزار) کے لئے خشک لکڑی کی طرح جلا کر اس کی جڑ ختم کر دینے کا حکم ہے۔ چین جہاں آج کل کوئی دینی و مذہبی حکومت نہیں وہاں بھی مہاتما بدھ کی مجسمے کی توہین، فوجداری جرم ہے۔ ۲۹ مارچ ۱۹۹۰ء کو چین کے صوبے سی چوان میں وانگ ہونگ نامی شخص کو جس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مہاتما بدھ کے مجسمے کا سر کاٹا تھا سزائے موت سنائی گئی تھی۔

افغانستان میں طالبان نے بدھ کے مجسمے کو گرایا تو یورپ و امریکہ نے کتنا شور مچایا تھا؟۔ اسی طرح یہودیوں کے ہاں خدا رسول، یوم سبت اور ہیکل کی توہین جرم تھی اور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سردار کاہن نے اسی طرح کا الزام لگا کر پھانسی کی سزا کا مطالبہ کیا تھا تفصیل (کتاب مقدس احبار باب ۲۴ فقرہ ۱۶) اور متی کی انجیل باب ۱۶ فقرہ ۲۵-۶۳) میں دیکھی جا سکتی ہے رسولوں کے اعمال کے مطابق مسیحی مبلغ متقنس اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری پولس پر یلغار انہی الزامات کے بہانے کی گئی تھی۔

رومن ایمپائر میں جب شہنشاہ جسٹینین (قسطنین) عیسائی ہوا تو قانون میں انبیاء بنی اسرائیل کی جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو توہین جرم قرار پایا۔ روس میں بھی یہ قانون جاری رہا۔ انقلاب کے بعد مقدس انبیاء کی جگہ اسٹالن نے لے لی۔ لینن کے ساتھی ٹرانسکی کا المناک انجام اس کی مثال ہے جو بھاگ کر

امریکہ چلا گیا تھا مگر وہاں بھی جان نہ بچ پائی۔ برطانیہ کا کامن لاء توہین مسیح بائبل کی اہانت فیمی لاء کے زمرے میں قابل سزا جرم قرار دیتا ہے۔
انسائیکوپیڈیا آف ریلیجئن جلد ۲ صفحہ ۲۴۲، بائبل آف میتھیو یعنی متی کی انجیل ۲۸-۱۲ کے حوالے سے اور بائبل، کتاب استثناء بات ۱۷ کے مطابق انبیاء اور ان کے ساتھیوں کی توہین کرنے والے کی سزا موت ہے چنانچہ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کو جان سے مارا جاتا ہے۔ مثلاً ۱۵۳ء میں برطانیہ (الزبتھ دور) میں پانچ افراد کو۔ ۱۵۵۳ء میں روم کے بروٹو نامی شخص کو حضرت عیسٰی علیہ السلام کی توہین کے جرم میں سزائے موت دی گئی۔ برطانیہ میں ۱۸۲۱ء سے ۱۸۳۴ء تک ۷۳ افراد کو مار دیا گیا۔ یہ سزا امریکہ میں بھی دی جاتی رہی۔
۱۹۶۸ء کے بعد امریکہ میں کوئی مقدمہ دائر نہیں ہوا کے مذہبی اور عدالتی امور الگ الگ کر دیئے گئے تھے۔ پھر بھی چند سال قبل ڈیوڈ نامی شخص کو اس کے ۳۰۰ لوگوں کے ساتھ اس لئے جلا دیا گیا کے اس نے دعوٰی کیا تھا حضرت عیسٰی علیہ السلام کی روح اس میں حلول کر گئی ہے۔ برطانیہ کے ڈینس لی مون نے (جو کہ گے نیوز کا ایڈیٹر تھا) ایک مزاحیہ نظم لکھی پھر معافی بھی مانگی اور وضاحت کی کہ محض تفریح طبع کی خاطر ایسا کیا پھر بھی جیوری نے اس کو سزا سنادی وہ اپیل لے کر ہاوس آف لارڈز میں گیا مگر سزا بحال رہی۔
۲۷ جنوری ۲۰۰۳ء میں ٹیلی گراف میں اسرائیل کے وزیر اعظم کا کارٹون شائع ہوا کہ وہ فلسطینی بچوں کی کھوپڑیاں کھا رہا ہے یہودیوں کے احتجاج پر معذرت کی گئی۔ اٹلی کے وزیر اعظم نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی مشابہہ حکومت کی بات کی پھر اس پر معذرت کی۔ محمد علی (کلے) نے ویت نام جنگ کے متعلق امریکی پالیسی پر بیان دیا اس کا عالمی چیمپیئن کا ٹائٹل چھین لیا گیا۔ الجزیرہ ٹی وی نے چھ امریکی

فوجیوں کی لاشیں دکھائیں، احتجاج کیا گیا بلکہ اس کے آفس پر بمباری کر کے تباہ کر دیا گیا اور عملے کے لوگوں کو شہید کر دیا گیا۔ اسرائیل کے لبنان پر حملے کے بعد کونڈالیزا رائس نے گریٹر اسرائیل کی بات کی اس پر ایک فلسطینی اخبار نے کارٹون بنا کر کونڈا کا مذاق اڑایا تو امریکی محکمہ خارجہ نے شدید احتجاج کیا۔ مثالیں بے شمار ہیں۔

۱۵ اپریل ۲۰۰۸ء کو فرانس کی پارلیمنٹ نے خواتین کو وزن کم کرنے پر ابھارنے والے اشتہارات شائع کرنے کے کو جرم قرار دیا اور اس کی خلاف ورزی پر ۲ سال قید اور ۳۰ ہزار یورو جرمانے کی سزا قرار دی اور اگر کوئی خاتون مر گئی تو اشتہاری کمپنی یا میگزین واخبار کے ایڈیٹر کو ۳ سال قید اور ۴۵ یورو کی سزا کا امکان۔ فرانس کے وزیر صحت نے اس موقع پر کہا کے نوجوان لڑکیوں کو وزن گھٹانے کے لئے کم خوار کی پر مائل کرنا، اظہار رائے کی آزادی نہیں بلکہ ایسے پیغام موت کے پیغامات ہیں۔

ہر ملک میں اظہار رائے کے لئے حدود متعین ہیں اس لئے گستاخانِ یورپ کو خباثتوں اور مسلمانوں کی دل آزاری کے اقدامات پر اس بہانے کو استعمال کرنا ایک طرح کی واضح دہشت گردی ہے۔ خود ڈنمارک کے اسی اخبار (شلنڈر پوسٹن) کے جس نے خاکے اڑانے کی جارت وسازش کی تھی ۲۰۰۴ء میں اس کے کارٹونسٹ کرسٹوفر زیلر نے حضرت عیسی علیہ السلام کے خاکے بنانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کے اس سے عیسائیوں کے جذبات مجروح ہوں گے یعنی یورپ وامریکہ کے گستاخ جان بوجھ کر مسلمانوں کو آزار پہنچاتے ہیں۔ مذہبی عقیدتیں نازک اور حاس ہوتی ہیں ان کا تعلق دماغ سے زیادہ دل کے ساتھ ہوتا ہے۔

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبریل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

دل کے ہاتھوں مجبور عقیدت مند کبھی اپنی مقتدا اور مقدس ہستیوں پر حرف زنی وحرف گیری قبول نہیں کر سکتے یہی وجہ ہے کے سورہ انعام میں ہے:
معبودان باطلہ کو بھی گالی نہ دو کے کہیں ان کے ماننے والے سچے اللہ کو بے علمی سے گالی نہ دے دیں۔ دنیا میں جہاں بھی مذہب اپنے زندہ شعور کے ساتھ موجود ہے وہاں اس مذہب کے بانیان ومقتداء کی توہین پر کڑی سے کڑی سزائیں رکھی گئی ہیں۔ البتہ اگر کسی جگہ عیاشی ہی کو بطور مذہب اپنا لیا جائے تو سوچ کے دھارے بدل جائیں گے اور وہاں کے مردہ ضمیر آزادی رائے کے نام پر سب کچھ سہہ جاتے اور قبول کر لیتے ہیں
۔قرآن پاک ہمیں بتاتا ہے کے نمرود کے دور میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آذر سے بتوں کے بارے میں جب کہا: اے میرے باپ ان کی عبادت کیوں کرتے ہو جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی آپ کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔(مریم)
پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کو توڑ ڈالا تو بت پرستوں نے مشورہ کیا کے کیا سزا دی جائے؟ تو وہ لوگ پکار اُٹھے اور کہنے لگے: اسے جلا دو۔(انبیاء)
گویا اگر مذہبی عقیدتیں باقی ہوں تو جھوٹے مذہب بھی اپنی مقتدر ہستیوں کی توہین پر سنگسار کرنے اور جلانے پر تُلے نظر آتے ہیں۔
تیسری صدی عیسوی میں ایران میں بہرام اول کے دور میں مانی کو مذہبی عقائد کی توہین کرنے کے جرم میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی کھال اتار کر اور اس میں بھس بھر کر جندی شاہ پور کے دروازے پر لٹکا دیا گیا، بلکہ مانی کے بارہ ہزار پیروکار بھی قتل کر دیئے گئے۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر کیوں مجبور کیا گیا تھا؟ انہی مذہبی عقائد کی خلاف ورزی پر عیسائی ادوار میں گلیلیو کو سزائے موت کا حکم کیوں ہوا؟۔
جادوگرنیوں کے نام پر ہزاروں عورتوں کو کیوں جلایا گیا؟۔

محض اسی باعث ہندوؤں کے ہاں ویدوں کی نندنا یعنی بے قدری کرنے والا ناستک ویدوں کے علم کا مخالف ہوا اس بدذات کو جڑ بنیاد کے ساتھ ناس (تباہ) کر دیا جائے ۔بائبل کتاب خروج میں ہے "تم سب کو ماننا وہ تمہارے لئے مقدس ہے جو کوئی اس کی بے حرمتی کرے گا وہ ضرور مارا جائے گا" (اعمال باب ۲۱، فقرہ ۲۷-۳۶)۔ بائبل کی کتاب استثناء میں ہے "اگر کوئی گستاخی سے پیش آئے اور کاہن کی بات اور قاضی کا کہا نہ مانے وہ شخص مار ڈالا جائے"۔

اٹھارویں صدی تک برطانیہ وغیرہ میں توہینِ مسیح کی سزا موت ہی رہی ہے ۔چند مثالیں جو ہمارے سامنے آئی ہیں: ۱۵۵۳ء (الزبتھ دور) میں ۷ افراد کو موت کی سزا دی گئی۔ ۱۵۵۹ء میں ہنگری میں ڈیوڈ نامی پادری کو سزائے موت ملی۔ ۱۶۰۰ء میں روم میں بروٹو نام کے شخص کو مار ڈالا گیا۔ ۱۸۳۳ء تک تھوڑے عرصے میں برطانیہ ۷۲ افراد اس جرم کی سزا میں مارے گئے۔ اب اگرچہ برطانیہ میں کام لاء ہے پھر بھی اس کی رو سے جو توہین مسیح یا کتاب مقدس کی سچائی کا انکار کرے وہ بلاس قیمی کا مرتکب ہوگا اور اس کی سزا تخت و تاج برطانیہ یا حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم کے مطابق عمر قید تک ہو سکتی ہے۔

لندن کے اخبار دی ٹائمز کے مطابق برطانوی عدالت نے ۲۷ اگست ۱۹۸۸ کو گے نیور کے ایڈیٹر ڈینز لیمور (جس نے ۱۹۸۷ء کو ایک نظم میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بارے میں تضحیکی الفاظ کہے تھے) کے خلاف فیصلہ سناتے ہوئے کہا خلوص اور احترام کا ماحول ہی بلاس فیمی کے منافی نہیں دیکھنا پڑتا ہے کے اس طرح کے الفاظ و اقدامات سے عیسائی مذہب کے ماننے والوں کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں؟۔

اس بارے میں واضح قانون موجود ہے۔ ہر وہ پبلیکیشن، بلاس فیمی متصور ہو گی جو خدا، یسوع

مسیح یا بائبل کے بارے میں دشنام طرازی، توہین آمیز اور مضحکہ خیز مواد پر مشتمل ہو۔

قانون آپ کو یہ اجازت دے سکتا ہے کے عیسائی ملک پر حملہ کریں تختہ الٹ دیں یا عیسائی مذہب کا انکار کر دیں لیکن مذہب کے بارے میں نازیبا اور غیر معتدل الفاظ و اقدام کی اجازت ہر گز نہیں۔ گستاخانہ کلمات اور بے ادبی کی سزا اور حوصلہ شکنی کے لئے دنیا کے کئی ممالک میں قوانین ہیں مثلا:

۱۔ آسٹریا (آرٹیکل ۱۸۹، ۱۸۸ کریمنل کوڈ)۔

۲۔ فن لینڈ (سیکشن ۱۰ اچیپٹر ۱۷ پینل کوڈ)۔

۳۔ جرمنی (آرٹیکل ۱۴۷ کریمنل کوڈ)۔

۴۔ ہالینڈ (آرٹیکل ۱۴۷ کریمنل کوڈ)۔

۵۔ اسپین (آرٹیکل ۵۲۵ کریمنل کوڈ)۔

۶۔ آئرلینڈ (آئرلینڈ کے دستور کے آرٹیکل i,۱، ۶، ۴۰ کے مطابق کفریہ مواد کی اشاعت ایک جرم ہے منافرت ایکٹ ۱۹۸۹ء کے امتناع میں ایک گروہ یا جماعت کے لئے مذہب کے خلاف نفرت بھڑکانا بھی شامل ہے۔

۷۔ کینیڈا (سیکشن ۲۹۶ کینیڈین کریمنل کوڈ) کہ عیسائی مذہب کی تنقیص و تضحیک ایک جرم ہے۔

۸۔ نیوزی لینڈ (سیکشن ۱۲۳ نیوزی لینڈ کرائمز ایکٹ ۱۹۶۱) مثال کے طور پر عیسائی دنیا میں گرجوں کی تقدیس کو قانون کا درجہ حاصل ہے۔

بعض یوری ممالک کے دساتیر میں ان کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ ڈنمارک کے دستور کی سیکشن ۴ (سٹیٹ چرچ) کی مثال موجود ہے جس میں کہا گیا ہے

اور یحیلیکل لوتھرن (پروٹسٹنٹ) چرچ ڈنمارک کا ریاستی قائم کردہ چرچ ہوگا اور اس کی مدد و اعانت ریاست کی ذمہ داری ہوگی۔

آزدی تقریر و تحریر ایک بنیادی حق تو ہے مگر یہ مطلق حق نہیں۔ اقوام متحدہ کے سابق سیکرٹری کوفی عنان نے ڈنمارک ناروے کے گستاخون کی طرف سے خاکوں کی اشاعت پر کہا تھا: میں بھی آزادی تقریر و تحریر کا احترام کرتا ہوں مگر یہ آزادی مطلق نہیں ہوتی۔ سابق برطانوی وزیر خارجہ جیک اسٹرا نے کہا تھا: آزادی رائے کا ہم سب احترام کرتے ہیں لیکن بے عزتی اور اشتعال انگیزی کی کوئی چھوٹ نہیں دی جا سکتی۔ میرے خیال میں ان خاکوں کی بار دگر اشاعت زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔ امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی طرف سے بیان جاری ہوا تھا: یہ خاکے واقعی توہین آمیز اور مسلمان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا موجب ہیں۔

ان تمام بیانات کے باوجود گستاخانِ یورپ و امریکہ مسلمانوں کے دل کا خون کر رہے ہیں اور مسلسل دل آزاری کرتے چلے جا رہے ہیں کیوں؟۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق اپنے خیالات، معلومات اور آراء کا گورنمنٹ کی پابندیوں سے آزاد ہو کر اظہار کر سکنا آزادی اظہار رائے کہلائے گا۔ کینیڈین سپریم کورٹ نے آزادی رائے کے بارے میں اہم مقاصد بیان کئے کہ:

۱۔ جمہوریت کے فروغ کے لئے۔

۲۔ ریاستی یا گروہی زیادتیوں کی روک تھام کے لئے۔

۳۔ حقیقت کی تلاش کے لئے ہر فرد آواز اُٹھا سکتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا آزادی رائے کی تعریف کے ساتھ ساتھ ہر اس گفتگو یا رائے پر پابندی کی بات کرتا ہے جو واضح حقیقی خطرے کی موجب ہو یعنی:

ا۔ کسی پر بہتان لگایا گیا ہو۔

۲۔ فحاشی کی موجب ہو۔

۳۔ کسی پر دباؤ ڈال کر مجبور کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

اس طرح اقوام متحدہ کے اعلامیہ برائے سیاسی و سماجی حقوق جو جنرل اسمبلی نے ۱۹۶۶ء میں منظور کیا تھا کا آرٹیکل ۲۰ تشدد کے فروغ نسلی تعصب مذہبی منافرت اور کسی بھی قسم کے امتیازی رویئے پر مبنی تقریر و تحریر پر پابندی کی بات کرتا ہے۔ اظہار رائے کی بے مہار او کھلی آزادی، نسلی گروہی لسانی و علاقائی عصبیتوں کے فروغ اور باہمی فساد کا باعث بن سکتی ہے۔ اس کے ذریعے کسی کے عقائد اور مذہب کی تضحیک کے ذریعے قتل و غارت گری کی راہ بھی کھل سکتی ہے۔ اسی لئے تقریباً ہر جمہوری ملک میں اسے قانونی طور پر روکا گیا ہے اور قابل تعزیر جرم گردانا گیا ہے۔

خود ڈنمارک (جہاں سب سے پہلے خاکوں کی بدطینتی سامنے آئی تھی) کا قانون بھی خاموش نہیں۔ وہاں بھی ناموس مذہب کا قانون بالاس فیمی لاعرصے سے موجود ہے اور ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۴۰ کے مطابق جو لوگ کسی مذہبی برادری کی عبادت اور مسلمہ عقائد کا کھلا مذاق اڑائیں یا ان کی توہین کریں ان کو جرمانے اور قید کی سزا دی جائے گی۔ یورپ و امریکہ کو اپنی تہذیب و تمدن پر بہت ناز ہے ایک طرف تو وہ پرندوں اور جانوروں کے تحفظ اور آرام کی خیال کرتے نظر آتے ہیں لیکن جب اسلام اور مسلمانوں کا معاملہ آجائے تو ان کے بعض شہریوں کی سوئی ہوئی حیوانیت کیوں جاگ اُٹھتی ہے؟۔

پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی کے ذریعے صرف مسلمانوں کے کلیجے پر ہاتھ ڈالنا، مضطرب کرنا اور زندگی تلخ تر بنانا ہی ان کا مقصد کیوں بن جاتا ہے؟۔

والسلام علیکم ورحمہ اللہ وبرکاتہ!

## (2) مسئلہ تکفیر کب فتنہ تکفیر بنتا ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

مسئلہ تکفیر اہل السنۃ والجماعۃ کے ہاں ایک اہم اور مسلّم مسئلہ ہے۔ اور آئمہ اہل السنۃ سے دونوں قسم کی تکفیر (مطلق اور معیّن) ثابت ہے۔ بلاشبہ مخصوص، استثنائی اور ناگزیر حالات میں دین اسلام کی حفاظت کے پیش نظر تکفیر کا مسئلہ شرعی حکم میں داخل ہے لیکن فی زمانہ حالات کے جبر، حکمرانوں کے ظلم اور استحصال جیسے اسباب نے تکفیر کے مسئلے کو شرعی حکم سے زیادہ ردعمل، انتقامی کاروائی اور استثنائی سے زیادہ عمومی حکم کا درجہ دے دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین کا ایک اہم مسئلہ مسلمانوں کے درمیان فتنہ کی شکل اختیار کرتا جارہا ہے اس تحریر میں ہم ان بنیادی وجوہات کو اجاگر کریں گے کہ جن کی بنیاد پر مسئلہ تکفیر فتنہ تکفیر بنتا ہے اور ہمارے معاشرے کے مخلص اور دین کا درد رکھنے والے افراد کو نگلتا چلا جاتا ہے ہم اللہ سے دعا گو ہیں کہ وہ حق بات کو بیان کرنے کی توفیق دے اور اسے قبولیت بخشے ۔ آمین

طالب دعا: ڈاکٹر عبداللہ السلفی

بسم اللہ الرحمن الرحیم حمد وثناء کے بعد!

اہل السنۃ کے ہاں مسئلہ تکفیر میں اصول وضوابط کا التزام اور اس مسئلہ میں کلام کے اہل لوگوں کی وضاحت اچھی طرح کر دی گئی ہے۔

مگر آج کل تکفیری لوگ (جو لوگوں کی بلا دلیل وغیر منصفانہ تکفیر کرتے ہیں) دعویٰ کرتے ہیں کہ کوئی بھی معیّن تکفیر کر سکتا ہے (یعنی کسی معیّن مسلمان کو کافر قرار دینا) اور تکفیر کرنے کے بعد اس کو معاشرہ میں واضح کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتے ہیں اور اس چیز کا انکار کرتے ہیں کہ تکفیر معیّن صرف جید علماء اور فقہاء کا کام ہے۔

تکفیری یہ کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ جن کی وہ تکفیر کر رہے ہوتے ہیں مثلاً معین حکمران وغیرہ علماء اہل السنۃ (جن سے خود تکفیری حضرات عقیدہ، تفسیر اور فقہ لیتے ہیں) وہ ان حکمرانوں کی معین تکفیر نہیں کر رہے ہوتے۔

یہاں سے یہ مسئلہ تکفیر فتنہ کی شکل اختیار کرتا ہے کہ اگر آجکل علماء اہل السنۃ حکمرانوں کی تکفیر معین نہیں کرتے تو یہ تکفیری حضرات اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں اب یہ کام ان پر اور ہر عام آدمی پر لازم ہے کہ چاہے وہ تکفیر معین کے اصول وضوابط جانے یا نہ جانے وہ اس کا مکلف ہو یا نہ ہو (یقیناً مکلف تو اہل علم ہی ہیں) وہ لوگوں کو کافر قرار دے گا خاص طور پر حکمرانوں کو معین کر کے، لہذا بغیر علم اور آگاہی کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنا انکا پسندیدہ مشغلہ ٹھہرا!!

کسی خاص شخص کی تکفیر کون کرے گا اور کن شروط وقیود پر کرے گا؟ ایک قابل و ضاحت مسئلہ ہے مگر تکفیری حضرات اس مسئلہ کو کبھی واضح نہیں کرتے مقصد صاف ہے تاکہ وہ اس پر خطر کام کو اس طرح مسح کریں کہ لوگ انہیں حق پر اور اہل السنہ کے علماء کو حقیر و گمراہ جانیں۔

یہ عام عادت ہے کہ تکفیری حضرات لوگوں کی نظر میں اہل علم کی اتنی تحقیر کر دیتے ہیں کہ لوگ اس مسئلہ میں الجھ جاتے ہیں۔

اب ہم اصل بحث کی طرف آتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ مسئلہ تکفیر کب فتنہ تکفیر بنتا ہے:

وہ لوگ جن کی تکفیر کی جا سکتی ہے وہ مختلف ہیں اسی طرح جو تکفیر کرنے کا حق رکھتے ہیں وہ بھی مختلف ہیں۔ یہ بات ہم آنے والی سطور میں سلف صالحین کے فہم کی روشنی میں واضح کریں گے انشاء اللہ۔

تکفیر کے لحاظ سے:

1۔ کچھ لوگ وہ ہیں کہ جن کی تکفیر کا حق صرف اور صرف علماء کو ہے اور کسی عامی کو یا دینی علم و حکمت سے کورے شخص کو نہیں۔

2۔ اور کچھ لوگ وہ ہیں جن کی ہر مسلمان تکفیر کر سکتا ہے بلکہ ہر مسلمان پر انکی تکفیر کرنا لازم ہے

۔

آیئے ہم اس مسئلہ کو تفصیلاً واضح کرتے ہیں۔

تکفیر کے لحاظ سے لوگ دو گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں:

اول: اصل کافر

دوم: اسلام سے ارتدار اختیار کرنے والا

اول: اصل کافر:۔

انکو بھی دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

)ا(۔ ایسے لوگوں کی تکفیر جن کا کوئی مذہب نہ ہو:

ان کی مثال دہریے لوگ ہیں (جو اللہ کے وجود اور اس کے خالق و مالک ہونے کے ہی انکاری ہیں) یا وہ لوگ (جو اللہ کو تو مانتے ہیں یعنی وجود کے قائل ہیں مگر دین بشمول اسلام کے نہیں) تمام مسلمان (عام آدمی، داعی، طلباء اور علماء اکرام) ایسے لوگوں کی تکفیر کر سکتے ہیں بلکہ کرنی واجب ہے اور اس گروہ کے ہر شخص کی بھی، جو ان جیسا عقیدہ اور اعمال رکھتا ہے

کیونکہ یہ عقیدہ اور اعمال کفر اکبر ہیں (ایسا کفر جو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے)

اللہ اور اس کے محبوب نبی محمد ﷺ نے ان لوگوں کی تکفیر فرمائی ہے اور اس پر علماء کا اجماع بھی ہے کہ یہ گروہ کافر ہیں۔

الشیخ عبید الجبری فرماتے ہیں:۔

" "یہ کفار ہیں کیونکہ انہوں نے اللہ کا کلمہ قبول ہی نہیں کیا"

مزید فرمایا:۔

" "ہر مسلمان کو جان لینا چاہئے کہ قرآن وحدیث اور علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ دین صرف دو قسم کے ہیں ایک وہ جو اللہ کا کلمہ قبول کرتا ہے اور یہ مسلمان ہیں اور دوسرا وہ جو اللہ کے کلمہ کا انکار کرتا ہے یہ کفار ہیں۔"

(ب) ایسے شخص کی تکفیر کرنا جو اسلام کے علاوہ دوسرے ادیان مثلاً عیسائیت، بدھ مت، سکھ ازم، اور یہودیت وغیرہ کو مانتے ہیں، تمام مسلمان (عام آدمی، داعی، طلباء اور علماء اکرام) ان کی تکفیر کر سکتے ہیں بلکہ کرنی چاہئے ہر اس شخص کی جو ان گروہوں میں سے ہے کیونکہ ان کے عقائد اور اعمال کفر اکبر ہیں اور ان کے کفر کا بیان قرآن و حدیث اور اجماع اہل علم سے واضح ہے کہ یہ لوگ محمد ﷺ اور اسلام پر ایمان نہیں لائے۔

الشیخ عبید الجبری مزید فرماتے ہیں:

وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی دعوت (دعوت آخر الزمان محمد ﷺ) سے اعراض کیا اور اسلام میں داخل نہیں ہوئے یعنی یہودی عیسائی اور ہندو وغیرہ۔۔۔ یہ کفار ہیں اس پر قرآن وحدیث اور علماء کا اجماع دلیل ہے۔ حتی کہ ایسے لوگوں کی تکفیر نہ کرنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے امام الدعوۃ محمد بن عبد الوہاب ؒ اپنے دس نواقض

اسلام میں ان لوگوں کے بارے جو اسلام کے علاوہ دوسرے ادیان کے پیروکار ہیں فرماتے ہیں تیسرا ناقض یہ ہے:

''جو کسی مشرک وکافر کو کافر یا مشرک نہ مانے یا وہ ان کے کفر میں شک رکھے یا انکے عقائد و نظریات کو درست تسلیم کرے، تو اس شخص نے کفر کیا۔''

)مولفات الشیخ محمد بن عبد الوھابؒ 212,213(

اب ہم دوسری قسم کی طرف آتے ہیں:

دوم: دین سے ارتداد اختیار کرنے والے:۔

کسی معیّن فرد کی تکفیر یا مسلمانوں میں سے معین مسلم حکمران کی تکفیر کرنا:

یہ کام صرف اور صرف متبحر فی العلم اور دین میں راسخ العلم کا حق ہے داعی یا دینی طالب علم کے لئے جائز نہیں بلکہ تمام طبقہ علماء بھی اس کے فیصلے کے مکلف نہیں ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان، ارکان اسلام اور ارکان ایمان کو تسلیم کرنے کا دعوے دار ہوتا ہے۔

قرآن وسنت میں ایسے شخص کی معین تکفیر نہیں کی گئی جیسا کہ گزشتہ بیان کردہ دو گروہوں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ ان کا اسلام کا اظہار اور مسلمان ہونے کا دعوی کرنا ہے۔

لہذا ایسے شخص کی تکفیر صرف تب ہی ممکن ہے جب اس کے فعل کا کفریہ یا شرکیہ ہونا قرآن وحدیث، فہم سلف سے ثابت ہو اور تکفیر معین کی تمام شروط پوری ہوں اور موانع (کفر سے بچانے والے اسباب) ختم ہو جائیں ان سب اصول وضوابط کا جائزہ لینے کے بعد صرف اور صرف اہل علم کو حق ہے کہ وہ کسی کلمہ گو کی تکفیر معین کریں کیونکہ وہ اس کے مکلف ہیں نہ کہ ہماری گلیوں، محلوں اور شہروں کے ''مفتیان!''

تنبیہ: اگر ثبوت دستیاب ہو بھی جائیں اور شروط تکفیر پوری ہونے اور موانع کے ختم ہونے (یعنی اس مسلمان کے کافر ہونے کے قواعد وضوابط پورے ہونے) کے بعد بھی اگر اہل علم کسی وجہ (بڑے مفاسد سے بچنے، کسی مصلحت یا صرف نظر کرتے ہوئے) تکفیر نہ بھی کریں تو یہ بات سیرت رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ کتنے ہی منافقین ایسے تھے جو تکفیر کے دائرے میں تھے مگر آپ ﷺ نے انکی تکفیر نہیں کی حالانکہ شروط وثبوت موجود اور موانع ختم ہو چکے تھے۔ اس قضیہ مصلحت ورد مفاسد کی مزید وضاحت کے لیئے ہم اس مسئلے میں افراط وتفریط کے شکار ایک معروف تکفیری پیشوا کہ جن کو تکفیری حضرات بطور رہنما پیش کرتے ہیں، کی کتاب 'شرح نواقص اسلام' سے ہی ایک اہم اقتباس درج کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

' 'ہمارے ہاں کچھ جذباتی نوجوان بالعموم یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ چلیں مان لیا یہ تین یا پانچ چیزوں موانع تکفیر ہیں (یعنی آدمی کی تکفیر کرنے میں مانع ہیں) لاعلمی، تاویل، اکراہ خطا اور نسیان۔۔۔۔۔۔۔

تو اب اگر ہم کسی کفریہ فعل میں ملوث شخص کی بات یہ دیکھ لیتے ہیں کہ نہ تو وہ لاعلم ہے اور نہ اس کے ہاں کوئی ایسی تاویل پائی جاتی ہے جو اس پر وہ حکم لگانے میں مانع ہوئی ہو نہ اس پر وہ کفر فعل کروانے کیلئے کسی نے بندوق تان رکھی ہے کہ ہم کہیں وہ کسی اکراہ کا شکار ہے نہ وہ خطا (یعنی بغیر قصد) وہ کام کر رہا ہے (بلکہ جانتے بوجھتے ہوئے اور بقائمی ہوش وحواس اس حرکت کا مرتکب ہو رہا ہے) اور پھر نہ ہی وہ کسی نسیان کا شکار ہے یعنی موانع تکفیر میں سے کوئی ایک بھی مانع اس شخص کے حق میں نہیں پایا جاتا تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اس شخص کو کافر نہ کہیں؟ یہ

نواجوان کسی وقت یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ علماء نے ایسے کسی شخص کو کافر کیوں نہیں کہا؟

بلاشبہ کسی وقت ہو سکتا ہے کوئی شخص نواقض اسلام کا مرتکب بھی ہو اور اس کے حق میں موانع تکفیر (یعنی لاعلمی خطا، تاویل یا اکراہ وغیرہ) بھی نہ پائے جاتے ہوں۔۔۔۔۔ یعنی وہ اصولاً پوری طرح تکفیر کا مستحق ہو، پھر کسی شرعی مصلحت کے پیش نظر یا دفع مفسدت کو مد نظر رکھتے ہوئے اہل علم اس کی تکفیر کے معاملہ میں توقف کیئے رکھیں یعنی اس پر ارتداد کے احکام لاگو نہ کریں اور معاشرے کے اندر ایک مسلمان سمجھا جانے کا اسٹیٹس کسی خاص وقت تک اس سے پھر بھی سلب نہ کریں۔

جامع ام القری مکہ مکرمہ میں عقیدہ کے ایک استاد اور ایک ممتاز عالم شیخ احمد آل عبد الطیف اس کی دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

’’نبوی معاشرے کے اندر منافقین کے کفریہ اعمال عمومی طور پر چھپے رہتے تھے یہ درست ہے مگر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ چند خاص منافقین کے کفریہ افعال ریکارڈ پر بھی آ گئے تھے منافقین میں سے چند متعین لوگوں کا نواقض اسلام کا مرتکب ہونا ان کے باطن تک محدود نہ رہ گیا تھا کہ جس کا مؤاخذہ صرف اللہ عالم الغیب کی ذات ہی قیامت کے روز جا کر کرے گی بلکہ ان کے ارتکاب کفر پر صاف بین شواہد پائے گئے تھے یہاں تک کہ ان کے ارتکاب کفر کا پول کھولنے والے صحابہ کی گواہی کی تائید میں آیات وحی اتری تھیں مثلاً آیت:

لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ

التوبة-66

یعنی (بہانے نہ بناؤ) عذرات مت تراشو یقیناً تم ایمان لے آنے کے بعد کفر کر چکے ہو۔

خاص متعین لوگوں کی بارے اتری تھی۔

**وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ**

**التوبۃ-74**

یعنی یقیناً یہ کفر کی بات بک چکے ہیں اور اپنے اسلام کے آنے کے بعد کفر کر چکے ہیں۔

یہ بھی کچھ خاص لوگوں کی بابت اتری تھی جن کا کفر طشت از بام ہو گیا تھا۔

**وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ**

**المنافقون-5**

یعنی جب ان سے کہا جائے آؤ اللہ کا رسول ﷺ تمھارے لئے استغفار کر دے تو وہ (گھمنڈ سے) اپنے سر موڑ لیں اور تم دیکھو کہ وہ باز رہتے ہیں اس حال میں کہ وہ تکبر کر رہے ہوتے ہیں۔

**هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنفَضُّوا**

**المنافقون-7**

خرچ نہ کرو ان لوگوں پر جو رسول اللہ ﷺ کے پاس ہیں۔ یہاں تک کہ یہ (آپ ﷺ کے گرد سے) چھٹ جائیں۔

یہ سب متعین لوگوں کے معاملہ میں پیش آیا۔ یوں مستند روایات میں ایسے متعدد وقعات ملتے ہیں کہ مدینہ کے اندر کچھ کلمہ گو لوگوں کا مرتکب کفر ہونا" باطن" کے دائرہ سے نکل کر "ظاہر" کے دائرہ میں آتا تھا جبکہ ہم جانتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے کچھ خاص مصالح کے پیش نظر ان کا کفر واضح اور معاشرتی سطح پر ان کے قابل مؤاخذہ ہونے کے بعد باوجود ان لوگوں پر ارتداد کے احکام لاگو نہیں کیے۔"

**اعتراض:**

اس کے رد میں بعض لوگوں کی جانب سے اگر یہ کہا جائے کہ یہ باتیں نبی ﷺ کو وحی کے ذریعے بتائی گئی تھیں جبکہ دنیوی احکام لاگو کرنے کیلئے معلومات کے انسانی ذرائع ضروری ہیں اس لیے نبی ﷺ نے ان لوگوں کی تکفیر نہ کی تھی یا وہ یہ کہیں کہ منافقین کا اس بات سے مکرنا کہ انہوں نے ایسی حرکات کی تھیں یا اس پر ایک طرح کا معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنا اس بات پر دلیل ہوئی کہ وہ اپنے اس کفریہ فعل پر قائم بہر حال نہ رہے تھے لہذا اس کو ایک طرح کا ظاہری رجوع باور کرتے ہوئے ان کی تکفیر سے اجتناب برتا گیا۔

جواب:

تو ان شبہات کے جواب میں ہم کہیں گے کئی ایک باتیں ایسی بھی ریکارڈ پر ہیں کہ کسی منافق نے کھلم کھلا ایک کفریہ قول یا رویہ ظاہر کیا (اس کو جاننے کیلیے وحی واحد ذریعہ نہ رہا) نیز اپنے اس کفریہ قول یا رویہ پر اس کا معذرت خواہانہ رویہ بھی ہر گز ریکارڈ پر نہیں مثال کے طور پر صحیح بخاری میں عبد اللہ بن ابی کا یہ رویہ کہ جب رسول اللہ ﷺ ایک گدھے پر سوار ہو کر عبد اللہ بن ابی کے پاس پہنچے تو وہ بے لحاظ بکنے لگا: (ایک عنی واللہ لقد اذانی نتن حمارک) "پرے ہٹو" واللہ (اللہ کی قسم) تمھارے گدھے کی سڑاند میرے ناک میں دم کر رہی ہے" تب انصار میں سے ایک صحابی سے نہ رہا گیا اور وہ عبد اللہ بن ابی کو مخاطب کر کے بولا ☹ واللہ لحمار رسول اللہ ﷺ اطیب ریحا منک) وللہ! رسول اللہ ﷺ کا گدھا بو میں تم سے کہیں بہتر ہے تب عبد اللہ بن ابی کے قبیلے کا ایک آدمی عبد اللہ بن ابی کیلئے طیش میں آیا اور اس انصاری کو گالیاں بکنے لگا اس پر ہر دو کے قبیلے کے لوگ اپنے آدمی کیلئے بھڑک اُٹھے اور دونوں گروہوں کے مابین کھجور کی چھڑیوں، ہاتھوں اور جوتوں سے مار پیٹ ہونے لگی"۔

) صحیح بخاری کتاب الصلح باب ماجاء فی الاصلاح بین الناس اذا تفاسدوا(

غرض بعض افراد سے اس قسم کے کفریہ افعال اور رویے کھلم کھلا سرزد ہونے کے باوجود بعض شرعی مصالح کے پیش نظر ان لوگوں کی تکفیر سے احتراز برتا گیا اور دینوی امور میں ان کا حکم ایک مسلمان کا سا رکھا گیا یہاں تک کہ ایک علیحدہ نص کے ذریعہ سے جب تک ان کی نماز جنازہ سے نہ روک دیا گیا آپ ﷺ نے ان کا جنازہ پڑھنا تک موقوف نہ کیا۔

مقصد یہ کہ کسی شخص کے حق میں موانع تکفیر اگر زائل بھی ہو گئے ہوں لیکن کچھ مصالح اہل علم کی نظر میں ایسے ہو جو اس کی تکفیر کی بابت سکوت کا تقاضا کریں یا اس کی تکفیر کرنے کی صورت میں وہ کچھ مفاسد اُٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ محسوس کریں تو اس صورت میں تکفیر سے احتراز کر رکھنا ان کے حق میں ایک جائز و شرعی رویہ ہو گا۔

عام لوگوں کو بہر حال اس مسئلہ (مسئلہ تکفیر) میں اہل علم ہی کے پیچھے چلنا ہے پس اگر کسی وقت شرعی اتھارٹی (جو کہ آج اس وقت علماء کسی شخص یا گروہ پر نواقص اسلام کے ارتکاب کے باوجود اس کو معین کر کے تکفیر کا حکم عائد کرنے سے محترز رہتے ہیں یا اس کے معاملہ میں بوجوہ صرف نظر کر رکھتے ہیں جس کی بنیاد کوئی خاص حفظ مصالح یا دفع مفاسد ہو جبکہ ان مصالح اور مفاسد کا موازنہ بھی ظاہر ہے اہل علم ہی کر سکتے ہیں تو یہ بات شرعاً غلط نہیں"۔

)نواقص اسلام از حامد کمال صفحہ نمبر 91-95(

لہذا تکفیری حضرات سے درخواست ہے اگر کوئی ایسی صورت حال پیش ہو اور علماء اہل السنۃ کسی معین شخص کی تکفیر میں (ثبوت و شروط پورے اور موانع ختم ہونے کے با وجود) توقف کریں تو ان پر لعن طعن اور مرجیئت کے فتوے جھاڑنے سے پرہیز کریں!

یہ کام محض اہل علم کا ہے۔ ہم اس میں چھیڑ چھاڑ کے اہل نہیں! یہ میدان ہمارا (عوام الناس اور عام اہل علم کا) نہیں ہے۔

شیخ السلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''کسی شخص کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ کسی شخص کو مسلمانوں میں سے کافر قرار دے۔۔۔ جب تک ثبوت پایہ تکمیل تک نہ پہنچ جائیں''

(مجموع الفتاوٰی 12/466)

مزید فرمایا:

''یقیناً کسی شخص کی تکفیر (معین) شروط اور موانع رکھتی ہے۔''

(مجموعۃ الفتاوی 12/487-488)

شیخ محمد عمر بزمل، امام ابن تیمیہؒ کی اوپر بیان کردہ تکفیر معیّن کے بارے دونوں بیانات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

کوئی شخص معین (مسلمانوں میں سے) علماء اہل السنہ کے نزدیک کافر نہیں بنتا ماسوائے مندرجہ ذیل وجوہات کے مکمل ہونے پر:

۱۔ ثبوت کا پایہ تکمیل کو پہنچنا (قرآن وسنت اور اجماع سلف صالحین سے)

۲۔ شروط کی مکمل موجودگی

۱۔ (علم) صحیح حصول علم

۲۔ (عمداً) کفریہ فعل کو جان بوجھ کر کرنا

۳۔ موانع زائل ہونے پر جو کہ مندرجہ ذیل چار ہیں:

۱۔ جاہل نہ ہو

۲۔ کفریہ کام پر مجبور نہ کیا گیا ہو

۳۔ غیر ارادی یا غلطی سے نہ چاہتے ہوئے کوئی کام سرزد ہو جانا

۴۔ متاوّل یعنی کسی تاویل کی بنیاد پر کفریہ کام کر رہا ہے۔

لہٰذا کسی معین شخص کو اس وقت تک کافر قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک اوپر بیان کردہ معاملات سے اس کو توثیق نہ ہو جائے، جو کہ تکفیر مطلق کے برعکس ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: یقیناً تکفیر مطلق کی وجہ سے تکفیر معین لازم نہیں آتی حتی کہ (ثبوت ایک خاص یا معین فرد میں پایہ تکمیل کو پہنچ جائے) شروط (تکفیر معین) پوری ہوں جائیں اور موانع ختم ہو جائیں۔

**(مجموع الفتاوٰی 12/487-88)**

یعنی ہم گزشتہ حصے میں یہ جاننے میں کامیاب رہے ہیں کہ کن لازمی اصولوں پر تکفیر کی جاتی ہے اوپر بیان کردہ صورتیں یہ تھیں:

۱۔ ثبوت کی موجودگی

۲۔ تکفیر معین کی شروط

۳۔ موانع تکفیر معین

یہ صرف کسی مسلمان کی تکفیر کے لیے ہے نہ کہ کسی کافر معین کے لیے کیونکہ وہ تو منکر اسلام ہیں۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں:

ہم (تمام مسلمان) اس شخص کو کافر سمجھتے ہیں جو مسلمانوں کے دین کے علاوہ دوسرے ادیان کے پیروکار ہیں۔

الشفاء تعریف حقوق المصطفی 2/1671

کیونکہ کسی معین مسلمان کو کافر قرار دینے کے لیے کچھ صورتیں درکار ہیں (مثلاً کفریہ عمل کا ہونا شروط کا پایا جانا، موانع زائل ہونا) لہٰذا عہدہ تکفیر صرف اور صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہے جو اسلام کا بھرپور علم رکھتے ہوں، علوم قرآن و تفاسیر کے اصولوں،

حدیث نبوی کے علوم اور استدلال فقہ پر دسترس رکھتے ہوں یہ وہ لوگ ہیں جو جانتے ہیں کہ شروط پوری ہیں یا موانع زائل ہیں یا یہ کہ کس کا کام کفریہ ہے اور کس کا نہیں۔ بجائے یہ کہ گلی محلوں کے مفتیان جو کہ ان علوم اور قواعد سے کورے ہیں اور ایمان و کفر پر فیصلے کرتے پھریں۔۔۔!

اس بنیاد پر الشیخ صالح الفوزان فرماتے ہیں:۔

' 'کسی شخص پر ارتداد کا حکم لگانا یا کسی شخص کو دین سے خارج قرار دینا صرف اہل علم کو زیب دیتا ہے اور وہ اہل علم جو راسخ العلم ہیں اور وہ شرعی قضاء کے عہدے پر ہوں یا مفتیان کرام ہوں۔ یہ بالکل دوسرے معاملات کی طرح ہی ہے۔ اور ہر کسی شخص کو ،طالب علم کو اور انکو جو علم کے لیے مقرر ہیں اختیار نہیں لیکن جو ان میں ناسمجھ ہیں۔

یہ ان کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی کے ارتداد کے بارے میں فیصلہ کریں چونکہ اس سے فاد پیدا ہوگا اور بعض اوقات ایسا ہوگا کہ کسی مسلمان کو کافر قرار دے دیں مگر وہ( حقیقت میں) نہ ہو لہذا کسی مسلمان کی تکفیر کرنا اگرچہ اس میں نواقص میں سے کوئی پایا بھی جاتا ہو تو یہ ایک انتہائی خطرناک کام ہے' '

' 'جس نے بھی اپنے بھائی کو کہا اے کافر، اے فاسق اور وہ نہ ہو تو الفاظ اسی کہنے والے پر لوٹ آتے ہیں۔"

لہذا وہ لوگ جو کسی شخص کے ارتداد کا فیصلہ کریں گے یا تو وہ قاضی ہوں گے جو فتوی دینے کے اہل بھی ہیں یا وہ جو ان کے فیصلوں کو نافذ کرتے ہیں یعنی مسلمانوں کے حکمران ہیں اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ محض بوکھلاپن ہے"

(مراجعان فی فقد الوافقی)

شیخ حفظہ اللہ اس بارے میں مزید فرماتے ہیں:

’’یہ جہلاء پر لازم ہے کہ وہ خاموش رہیں، زبان مت کھولیں اور اللہ سے ڈریں جو غالب اور جلال والا ہے اور علم کے بغیر کلام مت کریں۔‘‘

اللہ فرماتا ہے:

**وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ**

**الاعراف-33**

’’اور یہ کہ تم اللہ پر وہ بات کہو جو تم نہیں جانتے۔‘‘

پس کسی جاہل شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ علمی معاملات پر کلام کرے، خاص طور پر ایسے معاملات جن کا تعلق ایمان و کفر، جہاد و قتال اور الولاء والبراء سے ہو جہاں تک اہل علم کی عزت و حرمت پر طعنہ زنی اور غیبت کا تعلق ہے تو یہ غیبت کی شدید ترین قسم ہے اور یہ کوئی جائز صورت نہیں۔

اور جہاں تک موجودہ حالات ہیں جو گزر گئے ہیں یا گزر رہے ہیں تو یہ لازم ہے کہ اس کے بارے میں مکمل تصدیق اور باہمی مشورے کے بغیر اہل علم کی خدمت میں پیش کریں تاکہ وہ جائزہ لیں اور اس کے بارے میں شرعی فتویٰ جاری کریں نہ کہ خود مدعی، خود گواہ، خود قاضی اور خود ہی جلاد۔۔۔۔!

جہاں تک عام مسلمانوں کا اور طالب علموں کا تعلق ہے تو گزارش ہے کہ یہ انکا مسئلہ نہیں۔۔ خاص طور پر کفر و ایمان کے فیصلے کرنا۔

**وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا**

**النساء-83**

اللہ رب العزت کا فرمان ہے اور جب ان کے پاس امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے تو اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر وہ اسے رسول کی طرف اور اپنے حکم دینے والوں کی

طرف لوٹاتے تو وہ لوگ اسے ضرور جان لیتے جو ان میں سے اس کا اصل مطلب نکالتے ہیں۔

کہیں ایسے تمام لوگ اس سلسلے میں مغالطہ کھا کر خود ہی اس حکم کے مصداق ٹھہر جائیں گے جو وہ کسی پر لگا رہے تھے"۔

لہذا ایسے مسئلے میں زبان پر قابو رکھنا لازم ہے۔ اللہ اپنی پناہ میں رکھے!

یہ بہت ہی خطرناک مسئلہ ہے تو اس میں اللہ سے ڈرنا چاہیے زبان کھولنے سے بچنا چاہیئے ماسوائے انکے جو ان مسائل میں اختیار دیے گے یا ذمہ داری دیے گے ہیں!

آخر میں اس مضمون سے جو نتیجہ اخذ ہوا وہ مندرجہ ذیل ہے۔

ا۔ ایسے لوگوں کی تکفیر کرنا جو لادین ہیں یعنی دہریئے، ہر مسلمان پر بلا تفریق، مطلق یا معین دونوں طرح لازم ہے۔

۲۔ ایسے لوگوں کی تکفیر کرنا جو دوسرے ادیان کے پیروکار ہیں عیسائی، یہودی، ہندو وغیرہ ہر مسلمان پر بلا تفریق مطلق اور معین دونوں طرح لازم آتا ہے۔

۳۔ کسی مسلمان کی تکفیر کرنا:

صرف اور صرف راسخ العلم، اہل قضاء لوگ ہی اس عہدہ پر فائز ہیں ان کے علاوہ کسی کے لیے یہ کام جائز نہیں چاہے مطلق ہو یا معین!

ایک شبہ:

تکفیری حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح وہ ایسے شخص کو جو لادین و باطل ادیان پر ہو اسکی تکفیر کر سکتے ہیں ایسے ہی انکے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اگر کسی مسلمان کو کفریہ کام کرتا دیکھیں تو اس کی بھی تکفیر کرنا اپنا حق و فرض سمجھیں۔

لیکن یہ کوئی سادہ وجہ نہیں، وہ لوگ جن کا کوئی مذہب نہیں یا جو دوسرے ادیان کے پیروکار ہیں اور اسلام اور ایمان کی جزویات کے منکر ہیں ان کی تکفیر ہر مسلمان پر

بلا تفریق فرض ولازم ہے اس کے لیے شائد کثیر علم بھی درکار نہیں ہے۔ حتی کے ایک نو مسلم خود بخود یہ سمجھ جاتا ہے کہ پہلے وہ کافر کیوں تھا؟

جبکہ دوسری طرف کسی مسلمان شخص کو کافر قرار دینا چاہے عام مسلمان ہو یا حکمران یہ راسخ العلم افراد کا کام ہے اس وجہ سے کہ یہ ایک بہت ہی زیادہ احتیاط کا کام ہے کیونکہ وہ شخص اسلام کے اراکین اور ایمان کی جزویات پر ایمان رکھنے کا دعویدار ہے اور خود کو مسلمان گردانتا ہے۔

لہذا جو اہل علم اس کام کے مکلف ہیں ان کے لیے لازمی ہے کہ وہ مندرجہ ذیل چیزوں کا راسخ علم رکھتے ہوں۔

ا۔ جانتے ہوں کہ کفر کی کتنی اقسام ہیں۔

۲۔ تکفیر کے قواعد وضوابط سے مکمل آشنا ہوں یعنی (عمل کے کفریہ ہونے یا نہ ہونے، ثبوت کی صحت، شروط وموانع کے بارے راسخ العلم ہوں)

۳۔ وہ علوم قرآن وتفاسیر، شروحات احادیث واستدلال، علم حدیث، فقہ اور عربی لغت سمیت دوسرے دینی علوم پر بھرپور دسترس رکھتے ہوں اور بالخصوص وہ اس تکفیر مطلق اور معین کے بارے پورا علم رکھتے ہوں۔

عام مسلمان کو اس مسئلہ میں زبان کھولنے سے بچنا چاہئے اور اس کام میں الجھنے کی بجائے فائدہ مند علم اور نیک اعمال میں رغبت رکھنی چاہیے یہ اس کی درست سمت میں رہنمائی کرنے والی چیزیں ہیں اور اس مسئلہ کو انہی پر چھوڑ دیں جو اس کے ذمہ دار ہیں۔

خلاصہ

تمام مسلمان بلا تفریق مطلق اور معین دونوں طرح سے تکفیر کر سکتے ہیں مگر کسی مسلمان کی تکفیر مطلق ومعین صرف اور صرف اہل علم کو جائز ہے۔

کسی ایسے شخص کو کافر یا مرتد قرار دینا جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور محمد ﷺ کو آخری نبی مانتا ہو اور اس عقیدہ پر عمل پیرا ہو، چاہے وہ صرف جمعہ ہی کی نماز ادا کرتا ہو، رمضان کے روزے رکھتا ہو، حج کرتا ہو۔ بہت وسیع علم کی ضرورت ہے! لہذا غلط تکفیر اور اس کے عتاب سے بچنے کے لیے از حد ضروری ہے کہ اس کام کو متعلقہ لوگوں کے ذمہ ہی رہنے دیا جائے تاکہ کسی فتنہ وفساد سے بچا جا سکے!

وہ مسلمان جو عام لوگ ہیں، داعی ہیں یا طالب علم ان کو رسول اللہ ﷺ کی اس تنبیہ سے ڈرتے رہنا چاہئے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’مکر وفریب کے وہ سال قریب ہیں جو لوگوں پر آئیں گے، ان میں جھوٹے کو سچا کریں گے اور سچے کو جھوٹا اور چور کو ایماندار اور ایماندار کو چور اور رویبضہ اسی زمانے میں بات کرے گا“۔

لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ رویبضہ کیا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

”وہ حقیر اور کمینہ آدمی جو لوگوں کے عام معاملات (انتظام) میں دخل دے گا“۔

(ابن ماجہ، کتاب الفتن شدۃ الزمان حدیث 4172)

درود سلام ہو محمد ﷺ پر اور آل محمد ﷺ پر اور رحمتیں ہوں اصحاب واصحابیاتِ محمد ﷺ اور ان کے پیروکاروں پر!

## (3) فتنہ وحدت ادیان

الشیخ عبد الوکیل ناصر حفظہ اللہ

تعارف نظریہ وحدتِ ادیان:

فی زمانہ کسی بھی بین الاقوامی اجتماع میں جب تمام مذاہب کے ماننے والوں کو جمع کیا جاتا ہے تو عموماً مشترکہ طور پر اس اجتماع کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ:

’’تمام مذاہب یکساں اور برحق ہیں‘‘ اور کسی بھی مذہب کی پیروی سے کائنات کے خالق اللہ رب العالمین کی رضا اور خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور ہر مذہب اس دنیا کے مالکِ حقیقی کی طرف پہنچنے کا ہی ذریعہ ہے، لہٰذا انسان کوئی بھی مذہب اختیار کرے، جانا سب نے ہی جنت میں ہے۔ لھذا کسی ایک مذہب والے (خصوصاً اہل اسلام) کا اس بات پر اصرار کہ اب تا قیامت نجات کی سبیل صرف ہمارا دین و مذہب ہے یہ (معاذ اللہ) ایک بے جا سختی اور تشدد یا انتہا پسندی ہے، جس کا خاتمہ از حد ضروری ہے۔

اور پھر حقوقِ انسانیت، محبّت، خدمتِ خلق جیسے جذباتی نعروں کا سہارا لیکر وحدتِ ادیان کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔

پھر اس ’’نظریہ وحدت ادیان‘‘ کی تفصیل کچھ یوں بیان کی جاتی ہے کہ:

’’جب منزل ایک ہو تو راستوں کے جدا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا‘‘ یعنی ہر مذہب والا ایک بزرگ و برتر ذات کی بات کرتا ہے جسے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، کبھی اللہ تو کبھی بھگوان اور کبھی God جبکہ حقیقتاً تمام مذاہب اللہ کی بندگی اور خوشنودی حاصل کرنے کے ذرائع ہیں، اس لئے ہر مذہب میں حق و انصاف، انسان دوستی اور انسانی بھائی چارے کی تعلیم دی گئی ہے لھذا تمام انسانوں کو تمام

مذاہب کا برابر کا احترام کرنا چاہیے، کسی ایک مذہب یا دین کی پیروی پر اصرار تشدد اور بے جا سختی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مذکورہ بالا گفتگو گویا "وحدت ادیان" کے نظریہ کا خلاصہ ہے۔

بسا اوقات اسے یوں بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے کہ:

" "دین و مذہب" کی پیروی انسان کا "پرائیویٹ" معاملہ ہے خواہ جس "مذہب" کی چاہے اتباع کرے، اس پر ہرگز اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔

صاحب علم و صاحب مطالعہ حضرات جو کہ خصوصاً اسلام کا مطالعہ کما حقہ رکھتے ہیں وہ یقیناً اس بات سے اتفاق کریں گے کہ یہ "نظریہ وحدت ادیان" ایک جدید اصطلاح ہے کہ جسے اسلام دشمن عناصر نے یا احباب نما اغیار نے دینِ اسلام کی بڑھتی ہوئی عالمی مقبولیت کو روکنے اور اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کی خاطر ایجاد کیا ہے۔ اور یقیناً اس نظریہ کا حامل ہو کر کوئی شخص اسلام کی حقانیت، رفعت اور شان و عظمت کو کبھی اجاگر نہیں کر سکتا کیونکہ جوں ہی وہ اس قسم کی کوئی تحریر یا تقریر ضبط میں لانا چاہے گا تو اسے بے جا سختی اور تشدد و انتہا پسندی کے القابات سے نواز کر چپ رہنے کو کہا جائیگا۔

آج اس فتنہ "وحدت ادیان" کو مذہبی تعصبات کے خاتمے کے خوشنما لیبل کے ساتھ دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلانے کی کوشش ہر سطح پر کی جارہی ہے جس کے اثراتِ بد سے موجودہ مسلمان خصوصاً نئی نسل کسی حد تک متاثر بھی دکھائی دینے لگی ہے۔ دورِ حاضر میں کیونکہ یہ ایک "اسلام دشمن" عقیدہ اور نظریہ ہے تو اس کی بیخ کنی اور حقیقت اور خطرناکی کو واضح کرنے کیلئے بعض اہل علم نے بروقت مواد تحریری شکل میں مرتب کیا ہے، جن میں سے ڈاکٹر بکر ابو زید رحمہ اللہ کی کتاب :

**"الإبطال لنظرية الخلط بين الأديان"**

اور مولانا سلطان احمد اصلاحی کی کتاب: "وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام" بہت مفید دکھائی دیتی ہیں۔

مولانا مقصود الحسن فیضی (جمعیۃ العناط الخیریہ، سعودی عرب) نے بھی اپنی علمی تحریر "وفاداری یا بیزاری" میں اس "نظریہ" پر تفصیلی نقد کیا ہے۔

" "نظریہ وحدت ادیان" کو "تقارب ادیان" کا راستہ قرار دینے والوں پر شیخ امین اللہ پشاوری نے بھی اپنے فتاویٰ "الدین الخالص" جلد نمبر ۹ میں بڑی مضبوط گرفت فرمائی ہے۔

اسی نظریہ سے متاثر ہو کر کافروں کے کفر میں شک کرنیوالے یا انہیں کافر قرار نہ دینے والے حضرات کے اس "غلط نظریہ" پر سابق مفتی اعظم سعودی عرب الشیخ عبد العزیز بن باز رحمہ اللہ نے بھی علمی انداز سے نکیر فرمائی ہے جسے "مجموع فتاویٰ ومقالات متنوعہ" کی جلد نمبر 2 میں دیکھا جا سکتا ہے۔

فجزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء وتقبل جھودھم المبارکۃ۔

تاریخی پس منظر:

" "وحدت ادیان" کے اس غیر اسلامی نظریہ کو ہم تاریخ میں مرحلہ وار دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کس وقت کس شکل میں کس نعرے کے ساتھ صحیح عقیدے کے "بگاڑ" میں کارفرما رہا یا اسے اس "بگاڑ" کے لئے استعمال کیا گیا۔

**وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ**

**آل عمران-85**

ترجمہ: جو شخص اسلام کے سوا اور دین تلاش کرے، اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہوگا۔"

اسلام کے خلاف دشمنانِ اسلام کا یہ "ہتھیار" غالباً کافی پرانا ہے اور اس کے موجدین میں مشرکینِ عرب اور ملتِ یہود و نصاریٰ سرفہرست ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ اسلام کے مقابلے میں سب سے قبل مشرکینِ عرب نے اسلام قبول کرنے والوں کے ساتھ سختی، ظلم و ستم اور تشدد کا راستہ اختیار کیا اور جب اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو سودے بازی، ملمع کاری پر اتر آئے کہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول کو اپنا کر اسلام کا راستہ روکا جائے۔ سورۃ الکافرون کا سببِ نزول عمومی طور پر اسی موقعہ پر تقریباً سارے مفسرین نے بیان کیا ہے کہ: مشرکینِ عرب نے نبی مکرم ﷺ کے سامنے "اپنے زعم" میں ایک "درست" بات رکھی اور وہ یہ کہ ایک سال ہم آپ کے معبود اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبود (باطلہ) کی عبادت کریں، ہم حق پر ہوئے تو آپ کو بھی ایک حصہ حق کا مل جائیگا اور ہمیں آپ کے دینِ حق میں سے ایک حصہ مل جائیگا وغیرہ وغیرہ۔

جس پر یہ جواب الٰہیٰ نازل ہوا:

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ﴿١﴾ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٢﴾ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿٣﴾ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ ﴿٤﴾ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿٥﴾ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ﴿٦﴾

**الکافرون-4/1**

" آپ کہہ دیجیے: اے کافرو! جس کی تم عبادت کرتے ہو میں اس کی عبادت نہیں کر سکتا نہ تم عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں عبادت کرونگا جسکی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی

عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کر رہا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین"۔ اور پھر جا بجا یہی مفہوم اجاگر کیا گیا کہ:

قُلْ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُونِّي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ

الزمر-65

' 'آپ کہہ دیجئے اے جاہلو! کیا تم مجھ سے اللہ کے سوا اوروں کی عبادت کو کہتے ہو"۔

قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَمَّا جَاءَنِيَ الْبَيِّنَاتُ مِن رَّبِّي وَأُمِرْتُ أَنْ أُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٦﴾

غافر-66

' 'آپ کہہ دیجئے! کہ مجھے ان کی عبادت سے روک دیا گیا ہے جنہیں تم اللہ کے سوا پکار رہے ہو اس بنا پر کہ میرے پاس میرے رب کی دلیلیں پہنچ چکی ہیں، مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں تمام جہانوں کے رب کا تابع فرمان ہو جاؤں"۔

' 'وحدت ادیان" اور "تقارب ادیان" کے نام سے آج یہی کچھ ہو رہا ہے کہ کچھ لو اور کچھ دو کے تحت "ادیانِ باطلہ" کو بھی حق تسلیم کر کے سمجھوتا ایکسپریس چلائی جائے۔

ا۔ مدینہ منورہ میں بھی یہود و نصاریٰ نے حق کو جان کر بھی اپنی یہی دعوت دینی چاہی کہ:

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا

البقرۃ-135

' 'یہ کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔ تم کہو بلکہ صحیح راہ پر ملت ابراہیمی والے ہیں"۔

جواب ملا:

بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ

**البقرۃ-135**

’’اور ابراہیم خالص اللہ کے پرستار تھے اور مشرک نہ تھے‘‘۔

**دوسرا دور:**

خیر القرون (دورِ صحابہ، تابعین و تبع تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین) کے بعد علماءِ حق سے دوری اور دنیاوی مال وزر کی کثرت نے فتنہ بن کر جب علمِ تصوف کو رواج دیا تو ’’وحدت ادیان‘‘ کے فتنے نے پھر جان پکڑی اور یہاں تک کہہ دیا گیا کہ:

’’یہودیت، نصرانیت اور اسلام میں باہم حیثیت وہی ہے جو خود اسلام میں مسالکِ اربعہ (شافعیہ، حنابلہ) کی ہے، کسی بھی مذہب پر عمل کر کے انسان اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے‘‘۔ والعیاذ باللہ

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ 4/105 میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ ’’صوفی ازم‘‘ جسے آج عیسائی اور یہودی لابی ہر طرح سے سپورٹ کر کے اس کو بطورِ اسلام کے دنیا کے سامنے لانا چاہتی ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ صوفی ازم ’’وحدت ادیان‘‘ کے نظریہ کو قبول کرتا ہے اس قول کے ساتھ کہ انسان اگر محقق بن جائے (یعنی وحدت الوجود کا قائل ہو جائے، جو کہ کفریہ عقیدہ ہے) تو اس کے لئے پھر یہودیت اور عیسائیت قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کما لا یخفیٰ علی اھل العلم۔

**تیسرا دور:**

چودھویں صدی کے آغاز سے ہی تقریباً تمام عالمِ اسلام پر ہمیں یہود و نصاریٰ کا تسلط اور غلبہ دکھائی دیتا ہے اور وہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں اسلام کے اصل چہرہ کو مسخ کر دینے کے درپے دکھائی دیتے ہیں اسی تناظر میں ماسونیت (Freemasonry) تحریک نے ’’وحدت ادیان‘‘ کا نعرہ بلند کیا تاکہ یہود و نصاریٰ کے بارے میں جو

نفرت مسلمانوں میں پائی جارہی ہے وہ کم کی جاسکے اور اس طرح وہ جدید عالمی نظام کے تحت تمام ممالک (خصوصاً اسلامی ممالک) پر قابض ہو سکیں اور اس کام کے لئے انہوں نے مسلمانوں ہی میں سے کچھ لوگوں کو استعمال کیا (اور اس مقصد کے لیے اُنہوں نے نے بالخصوص اُن لوگوں کا انتخاب کیا جو دینِ اسلام سے متنفر ہوں، سیکولرازم و لبرل ازم کے حامی ہوں اور دینِ اسلام کے اصول و قوانین کو دقیانوسیت سے تعبیر کرتے ہوں، مغربی ذہنیت رکھنے والے ہوں اور انہیں ہی اپنی نجات دہندہ تسلیم کرتے ہوں یا پھر مادیت پرست ایمان و ضمیر فروش قسم کے لوگ ہوں)

جنہوں نے باقاعدہ بیروت میں ایک سوسائٹی قائم کی جس کا نام "جمعیۃ التالیف والتقریب" رکھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تحریک و سوسائٹی کے ممبران میں شیعہ، عیسائی اور یہودی بھی شامل تھے تاکہ "مطلوبہ مقاصد" کو آسانی سے حاصل کیا جاسکے۔

آخری مرحلہ:

غالباً یہ ہمارا دور ہے کہ جب ورثۃ الانبیاء (علماءِ حق) یکے بعد دیگرے ہم سے رخصت ہو رہے ہیں اور بظاہر تسلطِ اعیار غالب اور تسلطِ مسلمان سرنگوں دکھائی دے رہا ہے ایسے میں "وحدت ادیان" کے زہریلے عقیدے کو مزید تقویت دینے کے لئے اپنے اور بیگانے سب ہی "فرقہ واریت سے پاک پاکستان" کے خوشنما نعروں کو لیکر میدان عمل میں آبیٹھے ہیں اور "احترام مذاہب" کے نام نہاد دعوے بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ واللہ المستعان

اب ہنود و مجوس جیسے بتوں، شرمگاہوں اور جانوروں کی پوجا کرنے والے مشرکوں کو بھی مشرک کہنا اور سمجھنا، اور دیگر کافروں کو کافر کہنے اور لکھنے میں بھی "جھجک" محسوس کی جارہی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے بھی صراحۃً بلکہ اب تو "دلیلیں" دینے کی کوشش

کی جاتی ہے کہ یہود ونصاریٰ کو کب کافر مشرک کہا گیا ہے ؟اور پھر ستم در ستم یہ کہ دیگر ملت کافرہ کو اہل کتاب ہی باور کر لیا جائے تو حرج ہی کیا ہے ؟اور وہ بھی اس طرح کہ گویا"اہل کتاب" تو بس "موحد" ہی ہیں مشرک وکافر تو نہیں!!! واللہ المستعان علی ھذا الخُذلان۔

قرآن تو علی الاعلان "اہل کتاب" کو کافر اور مشرک کہتا ہے۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ

البینة-1

" اہل کتاب کے کافر اور مشرک لوگ جب تک کہ ان کے پاس ظاہر دلیل نہ آجائے باز رہنے والے نہ تھے (وہ دلیل یہ تھی کہ)"

هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ ۚ مَا ظَنَنتُمْ أَن يَخْرُجُوا ۖ وَظَنُّوا أَنَّهُم مَّانِعَتُهُمْ حُصُونُهُم مِّنَ اللَّهِ فَأَتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا ۖ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ ۚ يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُم بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ

الحشر-2

ترجمہ:وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے کافروں کو ان کے گھروں سے پہلے حشر کے وقت نکالا تمہارا گمان (بھی) نہ تھا کہ وہ نکلیں گے اور وہ خود بھی سمجھ رہے تھے کہ ان کے (سنگین) قلعے انہیں اللہ (عذاب) سے بچالیں گے پس ان پر اللہ کا عذاب ایسی جگہ سے آپڑا کہ انہیں گمان بھی نہ تھا اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا اور وہ اپنے گھروں کو اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ رہے تھے اور مسلمان کے ہاتھوں (برباد کروا رہے تھے) پس اے آنکھوں والو!عبرت حاصل کرو"۔

اور اب تو بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک بھی آپہنچی ہے کہ "وحدت ادیان" اور چند خوشنما نعروں کی آڑ میں یہ دعوت دی جارہی ہے کہ تمام مذاہب کی عبادت

گاہیں ایک ہی جگہ اور ایک ہی وال باؤنڈری میں بنائی جائیں، مسجد، کنیسہ، گرجا اور مندر یکجا ہوں حتیٰ کہ تمام مذاہب کی تعلیمات کو ایک ہی کتاب میں جمع کر دیا جائے اور پھر شاید نماز بھی ایک ہی "امام صاحب" کے پیچھے ہو جائے کہ "وحدت" تو یہی ہے نا!!

حاملین وحدت ادیان کے خوشنما نعرے:

" "نظریہ وحدت ادیان" کے حاملین، قائلین اور فاعلین "اقارب و اجانب" بظاہر بڑے خوبصورت نعرے لئے پھرتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ واقعی اب عالم دنیا کو اسی ڈگر پر چلانے کی ضرورت ہے، خواہ آخرت برباد ہی کیوں نہ ہو جائے۔ معاذاللہ۔

کہتے ہیں جی "وحدت ادیان در حقیقت وحدت ابدان سے ہے" "تقارب بین الأدیان تو دلوں کو جوڑنے کا نام ہے، وحدت ادیان دینی تعصب کا خاتمہ، دینی بھائی چارے کا پیغام، فرقہ واریت کا خاتمہ، فتنہ تکفیر کی بیخ کنی، انسان کی فلاح و بہبود کا راستہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

جبکہ سوسائٹی، تنظیم اور ادارہ جات میں بھی "وحدت ادیان" کا پیغام دینے کے لئے "جمعیۃ التالیف والتقریب" "مجمع الادیان، مسلم، کرسچن ویلفیئر سوسائٹی ایسے "گمراہ کن" نام اختیار کئے جاتے ہیں۔ انہیں نعروں میں سے یہ نعرے بھی ہیں، شیعہ سنی بھائی بھائی، اپنا مذہب چھوڑو نہیں اور دوسرے کے مذہب کو چھیڑو نہیں۔

حامیان نظریہ وحدت ادیان:

اس نظریہ کی ابتداء (کچھ اختلاف الفاظ کے ساتھ) مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ نے کی تھی جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے بعد ازاں ہندوستان میں اسے پروان چڑھا

یا گیا اور آج تو تمام عالم ہی گویا اس کی ترویج میں کوشاں ہے حتیٰ کہ سعودی عرب کے "شاہ صاحب" بھی اس کے مؤید دکھائی دیتے ہیں۔

ذیل میں ہم اجمالاً ترتیب سے اس نظریہ کے حامیان کے اسماء لکھتے ہیں مثلاً:

۱۔ یہود و نصاریٰ

۲۔ قادیانی

۳۔ شیعہ

۴۔ پرویزی

۵۔ متحد دینِ غامدی وغیرہ

۶۔ میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے اپنی جگہ "عوام میں" بنانے والے جن میں سرفہرست طاہر القادری اور مولانا وحید الدین خان ہیں۔

۷۔ ویلفیئر کے نام پر "انسان سے پیار کرو" کا پیغام دینے والے "سماجی ہمدرد"۔

۸۔ سیاست دان کہ جن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، جیسا دیس ویسا بھیس۔

۹۔ وحدت ادیان کی ترویج و اشاعت اور اسے آگے بڑھانے کی "مہم" کے سلسلے میں کچھ عرصہ قبل "مکہ کانفرس" "میڈرڈ کانفرس اور عالمی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں "مکالمہ بین الادیان" کے فضائل بیان کئے گئے اور اس مکمل کاروائی کی سربراہی "توحید کے علمبردار" مملکت سعودیہ عربیہ کو نصیب ہوئی۔

ایں سعادت زور بازو نیست۔۔۔۔نا (تفصیل کے لئے دیکھئے سہ ماہی "ایقاظ" جنوری تا مارچ ۲۰۰۹)۔

نظریہ وحدت ادیان کے برے اور بھیانک اثرات:

منافی اسلام اور ملحدانہ نظریہ سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے اپنا کس قدر نقصان کیا اس کا اندازہ کافرانہ شعار و تہوار کے بڑھتے ہوئے رجحانات سے کیا

جاسکتا ہے، عملاً اس باطل نظریہ کو قبول کر لینے کے مظاہر اب ہولی، دیوالی، ویلنٹائن، بسنت، کرسمس ڈے وغیرہ کی شکل میں پھلتے پھولتے نظر آرہے ہیں اور مختلف تاویلات وحیلوں کے ذریعے انہیں فقط ایک "موسمی تہوار" قرار دیکر مسلمانوں میں رائج کیا جارہا ہے حتیٰ کہ کرسمس ڈے پر نہ صرف "ہیپی کرسمس" کی صدائیں سنائی دیتی ہیں بلکہ نام نہاد "شیخ الاسلام" کہلوانے والے مذہبی سکالر اس موقعہ پر سرعام "محرف بائبل" کی "تلاوت شریف" سنتے دکھائی دیتے ہیں اور کیک بھی کاٹتے ہیں کہ کہیں "عیسائی مشنریاں" ناراض نہ ہوجائیں۔ واللہ المستعان اس باطل نظریہ "وحدت ادیان" کو غیر محسوس طریقے سے عوام وخواص ہر دو طبقوں نے قبول کر لیا ہے جس کے نتیجے میں "موالات محرمہ" سامنے آرہی ہیں مثلاً کفار کی نصرت وتائید، محبت اور دوستی، احترام وتعظیم، میل جول اور سکونت، کفار سے مشابہت اور باہم رازداری کے معاملات وغیرہ۔* اس باطل نظریہ کا ایک اثر یہ ہوا کہ اسلام کو جو فوقیت اور برتری دی گئی تھی کہ

"لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون"

وہ آج باقی نہیں رہی، بلکہ اس برتری اور امتیاز کی بات کو "بے جا تشدد" کا نام دیا جارہا ہے، حتیٰ کہ اس مسموم عقیدے کے حامل لوگوں نے ایک ہی امام "پوپ" کے پیچھے نماز پڑھ کر اسلامی اقدار کی دھجیاں بکھیر دیں۔ (دیکھئے وفاداری یا بیزاری از مقصود الحسن فیضی) مسلمان نہ تھے) کا نام صحابی رسول عائذ بن عمروؓ سے پہلے لیا تو نبی رحمت ﷺ نے عائذؓ کا نام پہلے لے کر جملہ کی تصحیح فرمائی اور فرمایا:

"الاسلام اعز من ذرك، الاسلام يعلو ولا يعلى"

**دارقطنی: 3578**

اس باطل نظریہ کو قبول کرنے سے ایک دوسرا خطرناک اثر یہ سامنے آیا کہ شریعت کا حکم

"الموالاۃ فی اللہ والمعاداۃ فی اللہ"

الولاء والبرار کی تعلیم پس پشت ڈال دی گئی جو ملت ابراہیم کی اساس تھی، اس نظریہ وحدت ادیان کے حامی ترکی کے صدر نے تمام دینی غیرت وحمیت سے ماورا ہو کر اپنے وزیر سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ قرآن مجید سے ایسی ۳۰۰ آیات حذف کر دی جائیں کہ جن پر اس زمانے میں عمل نہیں کیا جا سکتا۔ (دیکھئے وفاداری یا بیزاری)

اس وحدت کے نظرئے کو عملاً قبول کرنے میں ایک انتہائی برا اثر یہ ہوا کہ اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے کیا جانے والا جہاد "دہشت گردی اور انتہا پسندی" قرار دیدیا گیا۔ اور یوں اسلام کی کوہان کو کاٹ کر رکھ دیا گیا، حالانکہ یہ امر اس وقت تک کیلئے تھا کہ جب تک اس روئے زمین پر ایک اللہ کی بندگی عملاً نہ اختیار کر لی جائے۔ (تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں کتب احادیث کی طرف مراجعت فرمائیں)

وحدت ادیان کے نظریہ کو قبول کرنے کا نتیجہ یوں بھی نکلا کہ غیر مسلموں نے جو مسلمانوں اور ان کی اراضی پر جو قبضہ وظلم وستم روا رکھا ہوا ہے، اس سے دستبرداری کا اعلان کیا جائے اور اس تنازعہ کو ختم کیا جائے، خواہ اس سے اہل کفر کے ظلم کو تقویت ہی کیوں نہ ملے۔ مثلاً فلسطین پر ظالم یہودیوں کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے، فلسطین اور بیت المقدس کا مطالبہ ترک کیا جائے، ہندوستانی مسلمان ہندو تہذیب میں بس ضم ہو جائیں اور مسلمانان عالم کشمیر، بوسنیا،

چیچنیا کے مسلمانوں کی مدد غذا اور لباس سے تو کریں مگر جہاد کا نام مٹا ڈالیں، وغیرہ وغیرہ۔

وحدت ادیان کے بارے میں شریعت کا حکم:

اس باطل نظریہ کی حقیقت تاریخی پس منظر، اس کے علمبردار، اس کی قبولیت کے ملی مظاہر اور اس کی "مسموم" غرض وغایت جان لینے کے بعد یہ ضروری ہے کہ ہم اس نظریہ سے متعلق شریعت کا حکم دیکھیں، کیا شریعت اسلامیہ اس کی اجازت دیتی ہے؟ کیا اسلام اسے قبول کرتا ہے؟ یقیناً مذکورہ بالا سوالوں کا جواب نفی میں ہی ہو سکتا ہے خصوصاً سورۃ الکافرون تو یہی درس دیتی ہے کہ:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ﴿١﴾ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٢﴾ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿٣﴾ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ ﴿٤﴾ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿٥﴾ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ﴿٦﴾﴾

**الکافرون- 4/1**

ترجمہ: "کہہ دیجئے: اے کافروں! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جنکی تم عبادت کرتے ہو نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم ہی اسکی عبادت کرنے والے ہو جسکی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے"۔

یہ دوٹوک اسلامی فیصلہ ہے جس کے بعد "وحدتِ ادیان" کے نظریہ کو قبول کرنے کا کوئی جواز کسی مسلمان کے پاس باقی نہیں رہ جاتا۔

وجوہات درج ذیل ہیں۔

۱ (یہ نظریہ اسلام سے اصولاً و فروعاً متصادم ہے، کیونکہ اسلام کامل مکمل ہے اور اس کے بعد تمام ادیان منسوخ ہو چکے ہیں، اب نجات صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

**وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ**

**آل عمران-85**

ترجمہ: جو شخص اسلام کے سوا اور دین تلاش کرے، اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہو گا۔"

مزید فرمایا:

**إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ**

**آل عمران-19**

" "بیشک اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہے (۱) اور اہل کتاب اپنے پاس علم آجانے کے بعد آپس کی سرکشی اور حد کی بناء پر ہی اختلاف کیا ہے (۲) اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ جو بھی کفر کرے (۳) اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔"

(تفصیل کے لئے دیکھئے مجموع فتاویٰ و مقالات متنوعہ از شیخ ابن بازؒ 2/277-282)

نبی ﷺ نے فرمایا "اگر اس امت کا کوئی بھی یہودی یا عیسائی جو میری رسالت کے بارے میں سن چکا ہو اور پھر بھی میری شریعت پر ایمان نہ لایا تو مر کر جہنم میں جائے گا۔" (صحیح مسلم)

۲ (قرآن مجید سابقہ تمام کتابوں کا ناسخ بھی ہے اور ان پر حاکم و نگہبان بھی، اس کی موجودگی میں دوسری کسی کتاب (بائبل وغیرہ) کی ضرورت ہے اور نہ ہی اسے

قرآن سے ملایا جا سکتا ہے، منسوخ اور باطل تعلیمات کو حق کی تعلیمات کے مساوی سمجھنا بدترین گمراہی ہے۔

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ

المائدۃ-48

اور ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ یہ کتاب نازل فرمائی ہے جو اپنے سے اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کی محافظ ہے اس لئے آپ ان کے آپس کے معاملات میں اسی اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق حکم کیجئے اس حق سے ہٹ کر ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ جایئے تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک دستور اور راہ مقرر کر دی اگر منظور مولا ہوتا تو سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس کی چاہت ہے کہ جو تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے تم نیکیوں کی طرف جلدی کرو تم سب کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے، پھر وہ تمہیں ہر وہ چیز بتا دے گا، جس میں تم اختلاف کرتے رہتے تھے۔

معروف واقعہ ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے سیدنا عمرؓ کے توراۃ کا ورق پڑھنے پر کس قدر ناراضگی اور غضب کا اظہار کیا تھا اور فرمایا تھا

"لو بدا لکم موسیٰ فاتبعتموہ و ترکتمونی لضللتم عن سواء السبیل ولو کان حیا و ادرک نبوتی لاتبعنی"

سنن الدارمی: 435

لہذا "وحدت ادیان" کا نظریہ ایک گمراہ کن نظریہ ہے جو یقیناً طریقہ ارتداد ہے جو یہ سکھاتا ہے کہ تمام کتابوں کو ایک ہی جگہ لکھ کر مساوی درجہ دیا جائے۔ معاذاللہ

۳ (وحدت ادیان کا نظریہ قبول کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے احکام اسلام معطل ہو کر رہ جائیں جیسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ہے اور معروف عقیدہ توحید اور منکر اکبر شرک ہے، وحدت ادیان کے نظریہ کو قبول کر کے جب یہ مان لیا گیا کہ کسی کو کافر، مشرک یا گمراہ نہ کہیں تو پھر آپ کس طرح توحید وسنت کی آبیاری اور شرک وبدعت کی بیخ کنی کریں گے؟؟؟

۴ (نظریہ وحدت ادیان، اسلامی نظر الولاء والبراء (جو کہ اصل التوحید ہے) کے منافی ہے، مسلمان ہرگز اہل کفرۃ وفجرۃ سے یارانہ نہیں لگا سکتا، وہ صرف مسلمانوں سے ہی دوستی لگانے کا پابند ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ

المائدۃ-55

" (مسلمانوں)! تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اسکا رسول ہے اور ایمان والے ہیں جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور رکوع (خشوع وخضوع) کرنے والے ہیں"۔

اور اللہ تعالی کا فرمان ہے:

لَّا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

**المجادلة-22**

" "اللہ تعالٰی پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو آپ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے رکھتے ہوئے ہر گز نہ پائیں گے گو وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے کنبہ (قبیلے) کے عزیز ہی کیوں نہ ہوں یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالٰی نے ایمان کو لکھ دیا ہے اور جن کی تائید اپنی روح سے کی ہے اور جنہیں ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ سے خوش ہیں، یہ خدائی لشکر ہے آگاہ رہو بیشک اللہ کے گروہ والے ہی کامیاب لوگ ہیں۔

۵ (اس نظریہ مسمومہ کو قبول کرنا گویا کہ لوگوں کو اجازت دینا ہے کہ وہ شریعت محمدیہ سے ہٹ کر بھی کسی دوسری شریعت پر عمل کر سکتے ہیں اور کامیاب ہو سکتے ہیں، جب کہ ایک مسلمان ایسا سوچ بھی نہیں سکتا، شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ نے مذہب مشرکین وغیر مسلمین کی تصحیح کو نواقض اسلام میں سے شمار کیا ہے۔

ربّ العالمین سے دعاء ہے کہ وہ ہمیں صحیح معنوں میں قرآن وسنّت کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

**وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ**

**آل عمران-85**

"جو شخص اسلام کے سوا اور دین تلاش کرے، اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہوگا۔"

## (4) مسئلہ تکفیر اور اُس کے بھیانک نتائج

الشیخ محمد یعقوب طاہر رحمہ اللہ

مسئلہ تکفیر اور فتوائے خروج سے متعلق داعیان توحید، علمائے حق کا رویہ ہمیشہ محتاط رہا، وہ ایسا کرنے یا ایسی سوچ کو فروغ دینے کو ناپسند کرتے تھے اور ہمیشہ تلقین کرتے رہے کہ اصلاح احوال کا راستہ مسلم حکمرانوں کیخلاف بغاوت نہیں بلکہ حکمت و دانائی، دلپذیر وعظ و نصیحت اور نہایت موزوں و متوازن بحث و مباحثہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ

النحل-125

اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلایئے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجئے۔

دین اسلام کی بابت ہماری ذمہ داری احکام دین کو غیر متنازع انداز میں پیش کر کے صحیح منہج کو اجاگر کرنا اور یہ واضح کرنا ہے کہ اسلامی شریعت کا ایک ایک حکم، ایک ایک مسئلہ حکومتوں اور رعایا دونوں کے فوائد و مصالح کے فروغ کا ضامن ہے، اس کی تعلیمات اور ہدایات سے اس فتنے کا سر کچلنے کو کافی ہیں کہ جو اندرونی خلفشار کا سبب بنے اور معصوم انسانی جانوں کے ضیاع کا راستہ کھولے۔ عباسی دور خلافت میں خلق قرآن کے مسئلہ نے ایک فتنہ کی شکل اختیار کر لی، اربابِ اقتدار و اختیار کی بے رحم گرفت سے عامۃ المسلمین کے دل اس وقت دہل کے رہ گئے جب امام اہل السنۃ جناب احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی رحمہ اللہ جیسی شخصیت ان کے ہاتھوں بے پناہ اذیت و عقوبت کا نشانہ بنی، لیکن یاد رہے کہ جناب امام مظلوم نے حکمرانانِ

وقت کے خلاف نہ علم بغاوت اٹھایا، نہ خروج کا نعرہ لگایا نہ لوگوں کو ان کے خلاف کسی کاروائی پر اکسایا اور نہ ہی اس کی اجازت دی وہ تو اسے کفار کا طرز عمل قرار دیتے تھے، ایسے کسی اقدام کو ان سے تشبہ تصور کرتے اور حرام سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کتاب وسنت کی تعلیمات کے خلاف اور سمع وطاعت کے اصول کے منافی ہے۔

بصد افسوس! کہ مسلم اکثریت اور بالخصوص وہ علماء حضرات کہ جو دین متین اور شرع مبین کے فہم میں ید طولیٰ رکھنے کے ساتھ ساتھ دنیاوی امور پر بھی گہری بصیرت رکھتے ہیں، پھر بھی یہ فریضہ سرانجام دینے میں بخیل نظر آتے ہیں کہ عامۃ المسلمین کو تکفیری عناصر کے ہاتھوں میں کھلونا بننے اور خروج کی سوچ کے حاملین کے آلۂ کار بننے سے روک کر دعوتِ حق کا فریضۂ منصبی ادا کریں اور انہیں سمجھائیں کہ ایک تو خروج کا شرعی جواز موجود نہیں ہے، دوسرے یہ کہ زبانی وعظ ونصیحت کے ذریعہ تبدیلی۔ اصلاح لانے کے ذرائع ووسائل کما حقہ اختیار نہیں کیے گئے ہیں، پھر یہ بھی کہ مسئلہ اجتہادی ہے چنانچہ مخالف رائے کا بہر حال احترام کرنا ضروری ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب کوئی فتنہ زور پکڑ لیتا ہے تو جذباتی احمقوں کی یورش کے سامنے اہل خرد ودانش بے بس نظر آتے ہیں، فتنوں کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے، اللہ رب العزت نے فرمایا:

**وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً**

**الانفال-25**

اور تم ایسے وبال سے بچو! کہ جو خاص کر صرف ان ہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں سے ان گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ خروج کی سوچ کو ہوا دینے والوں سے شیخ الاسلام رحمہ اللہ بذریعہ مکتوب مخاطب ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ مسلم امہ کے مابین خلفشار

پھیلا کر کچھ مقاصد حاصل کر لینے کی نسبت یہ بہتر ہے کہ وحدتِ امت کو مقدم اور اجتماعیت کو برقرار رکھا جائے خواہ کہیں کوئی ناپسندیدہ امور کیوں نہ برداشت کرنے پڑیں، اور عقلمند انسان وہ ہوتا ہے جو اقدام کرنے سے پہلے نتائج پر نظر رکھتا ہے!!

یقیناً ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کی مسلمانوں کی حالیہ بیباکانہ جرأت نے اپنے مسلمان بھائیوں کے خون سے ہولی کھیلنے کی راہ ہموار کی ہے، اور باہم دشمنی ونفرت کی آگ بھڑکانے میں بنیادی سبب بنی ہے، یہ دراصل بزعم خویش مفکر بن بیٹھنے والوں کا ذہنی فتور ہے جو کتاب وسنت کے صحیح فہم اور مقاصدِ دین کے ادراک میں یتیم واقع ہوئے ہیں، بس سنے سنائے پر اور بے ہنگم سوچوں پر اوندھے گرے پڑے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ وطیرہ رہا کہ وہ اپنی اجتہادی رائے سے صرف اس لیے رجوع کر لیا کرتے کہ کہیں یہ امر وحدتِ امت پر اثر انداز نہ ہو جائے۔ صحیح بخاری میں سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے:

"تم فیصلے کرتے ہو، میں اختلاف کرنے سے گریز کرتا ہوں تاکہ اجتماعیت برقرار رہے، اور مجھے موت آئے تو وحدتِ امت کے امین ساتھیوں جیسی آئے۔ (صحیح بخاری 7/171)

راوی حدیث سیدنا عبیدہ خلیفہ راشد سیدنا علی مرتضیٰ سے عرض کرتے ہیں (ام ولد لونڈی کی فروخت کے بارہ میں) آپ کی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اجتماعی رائے میرے نزدیک آپ کی انفرادی سے بہتر ہے۔ سیدنا علی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کی رائے یہ تھی کہ ام ولد لونڈی کی فروخت جائز نہیں ہے مگر بعد میں فریق ثانی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور ام ولد لونڈی کی خرید وفروخت کے جواز کے قائل ہو گئے۔

برادرانِ امت! کفر وفسق کے فتووں کی یلغار نے مسلم امہ کو جس اندرونی خلفشار کی آگ میں جھونک دیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، اور اس کے نتیجے میں منہ بولتے بڑے نتائج اور تلخ حقائق سب پر عیاں ہیں، ان کی سنگینی سے دل پارہ پارہ، آنکھیں اشکبار، قیمتی املاک راکھ کے ڈھیر، آبادیاں سنسانوں میں تبدیل، خون کی ندیاں اور تباہی ہی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

کفر کے فتوے، وہ بھی بلا سوچے سمجھے:

کسی مسلم کو کافر قرار دینا ایک شرعی مسئلہ ہے، اور ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا اس میں احکام الٰہی و فرامین مصطفائی کو اساس بنایا جائے گا، جس طرح شرعی احکامات، دینی واجبات و فرائض اور حلال و حرام کا مصدر و محور اللہ اور رسول ہیں جیسا کہ فرمان مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

**فَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَلَالٍ فَأَحِلُّوهُ، وَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوهُ، أَلَا وَإِنَّ مَا حرم رسول الله صلى الله عليه وسلم كما حرم الله.**

**رواہ ابوداؤد: 4604**

جو چیز بزبان قرآن حلال ملے اسے حلال جانو، اور جو حرام ملے اسے حرام مانو، اور خبردار! جس چیز کو رسول اللہ نے حرام قرار دے دیا اس کی حیثیت بھی اللہ کے حرام کردہ امور جیسی ہے۔

بعینہ اسی طرح تکفیر میں اللہ و رسول ہی مرجع ہیں، کیونکہ جس جس قول و فعل کو کفر کہا گیا ہے، ضروری نہیں کہ وہ سبھی خروج از ملت کے موجب کفرِ اکبر کے زمرے میں شمار ہوتے ہوں۔

فتوائے کفر میں اللہ و رسول کو مرجع قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ کسی مسلم کو ہم تب تک کافر نہ کہیں جب تک اس کے کفر پر کتاب و سنت اور اجماع

امت سے ایسی صریح اور واضح دلالت سنہ مل رہی ہے کہ جس میں دیگر احتمال کا امکان باقی سنہ ہو۔

اس مسئلہ میں وہم و گمان، شبہات، اندازوں اور خیالی دعووں کو کبھی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا، اور بغیر قطعی الثبوت اور صریح الدلالت واضح دلائل کے اس پر زبان کھولنا گھمبیر اور انتہائی خطرناک مسائل سے دوچار کر دے گا۔ اور یہ بھی باور کراتے چلیں کہ شبہ موجود ہو تو شرعی حد تک نہیں نافذ کی جاتی، جبکہ اس کی مخالفت پر مرتب نتائج، کسی مسلم کو کافر قرار دے دینے کے نتائج سے کہیں کم سنگین ہیں۔

لہٰذا ایمان کا شائبہ بھی موجود ہو تو دعوائے تکفیر سے گریز رکھنا زیادہ ضروری ہونا چاہیے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو بلا دلیل کافر کہنے سے منع فرمایا: حدیث مبارک ہے کہ

أَيُّمَا امْرِءٍ قَالَ لأَخِيهِ يَا كَافِرُ. فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا إِنْ كَانَ كَمَا قَالَ وَإِلاَّ رَجَعَتْ عَلَيْهِ

صحیح مسلم: 1/56

جب کوئی شخص دوسرے کو "کافر" کہتا ہے تو ان دونوں میں سے کوئی ایک اس کا مستوجب ضرور ہوگا، اگر تو مخاطب کافر ہے تو ٹھیک ورنہ کہنے والا کافر ٹھہرتا ہے۔"

بلا سوچے سمجھے، بات، بے بات دوسروں کو کافر کہے جانا نہایت سنگین نتائج کو جنم دیتا ہے، مثلاً: دوسروں کے جان و مال کے درپے رہنا، ہنگامے اور قتل و غارت، ملی املاک کا ضیاع، نکاح کا فسخ ہو جانا، سلام و کلام ترک کر دینے کے باعث باہمی نفرت و انتشار اور قطع رحمیاں، حتی کہ دینی ارتداد تک بات جا پہنچتی ہے، بھلا چند شبہات کی بنا پر امت کو ایسے سنگین نتائج کی بھینٹ چڑھایا جا سکتا ہے؟

یہ تو رہی عامۃ الناس کے دائرہ تک محدود بات، اور اگر اربابِ حکومت واقتدار کی بات کریں تو نتائج کی سنگینی بیان کرنے سے قبل ہی زبان پر آبلے آنے لگتے ہیں کہ اب تو یورشیں ہی یورشیں، مسلح خروج وبغاوت، خون کی ندیاں، املاک کا ضیاع، آگ کے الاؤ، پرامن شہریوں کی زندگیاں اجیرن، افراتفری، بے چینی وبے کلی، اور لوٹ وگھسوٹ کا بازار گرم، جہاں نہ عزت محفوظ، نہ مال اور نہ ہی جان بلکہ معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہوتا ہے جبکہ ایسے کسی بھی اقدام کا کوئی شرعی جواز بھی نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِلاَّ أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللهِ فِيهِ بُرْهَانٌ

صحیح البخاری: 9/59

ہاں! کہ جب صریح کفر ہوتا دیکھو.... تو پھر.... کہ اس میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے دلیل تو ہو۔

تو معلوم ہوا کہ کفر کا فتوی لگانے سے پہلے اس کے ایسے صریح شواہد موجود ہونا ضروری ہیں جو کہ صحیح الثبوت ہوں، بصراحت عیاں دلالت کے حامل ہوں، اس میں سند أضعیف اور دلالت أغامض (غیر صریح) دلیل معتبر نہ ہوگی، اور یاد رہے کہ اس قسم کے الزامات اور فتووں میں کسی فرد یا عالم۔ کا خواہ کس قدر رسوخ ونبوغ علمی کے شاہکار ہوں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح وصریح دلیل کے بغیر کوئی بھی فتوی قطعاً ناقابلِ قبول ہوگا، اس سے مسئلہ کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

برادرانِ اسلام! فتوائے کفر میں احتیاط کے لزوم پر یہ فرمانِ الٰہی بہترین راہنما ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَن تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ

الاعراف-33

آپ فرمادیجیے کہ البتہ میرے رب نے صرف حرام کیا ہے ان تمام فحش باتوں کو جو اعلانیہ ہیں اور جو پوشیدہ ہیں اور ہر گناہ کی بات کو ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اس بات کو کہ اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس بات کو تم لوگ اللہ کے ذمے ایسی بات نہ لگادو جس کو تم جانتے نہیں۔

تکفیر کی شرائط اور فتوائے کفر کے سامنے رکاوٹیں:

کتاب وسنت کی نصوص سے بسا اوقات یوں لگتا ہے کہ ایسا اور ایسا کرنا، ایسا کہنا یا عقیدہ رکھنا کفر ہے، حالانکہ اس کا فاعل کافر نہیں گردانا جاتا، وجہ یہ ہوتی ہے کہ فتوائے کفر کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہورہی ہوتی ہے، کیونکہ یہ حکم بھی دیگر احکام شریعت کی طرح تبھی لاگو ہوسکے گا جب اس کے اسباب وشروط پورے ہورہے ہوں اور کوئی مانع حائل نہ ہو، مثلاً: جیسے میراث کے مسئلہ کو دیکھیے کہ اس کا بنیادی سبب میت سے قرابت ہے، لیکن اگر مانع حائل ہوجائے مثلاً: وارث ومورث کے مابین اختلاف دین، ہونے والے وارث کا اپنے مورث کو قتل کردینا وغیرہ تو ایسے میں حائل رکاوٹ کی وجہ سے یہ وراثت کا حقدار نہ قرار پائے گا، بعینہ اسی طرح:

مومن کو بالاکراہ کافر کے لبادہ میں رہنا پڑجائے۔

یاخوشی کے غلبہ یا فرطِ غم وغصہ وغیرہ کی وجہ سے زبان سے بلاارادہ وقصد کلمۂ کفر پھسل جائے، جیسے ایک آدمی نے فرطِ خوشی میں "اللھم أنت عبدی وأنا ربک" کہہ دیا تھا، تو اسے کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔

یا نص کے تفسیری فہم میں اجتہادی غلطی ہوجائے کہ شرعی دلیل کو فی غیر موضعہ منطبق کر بیٹھے۔

یا دلالت النص کو صحیح طور پر نہ سمجھ پانے سے کسی شبہہ کا شکار ہوکر کوئی کفریہ کام کر بیٹھے، حالانکہ اس کی علمی رسائی کے مطابق وہ عمل کفر نہیں، کیونکہ بھلے غلط فہمی کی بنا پر سہی لیکن وہ یہ کام بربنائے دلیل ہی کر رہا ہوتا ہے، تو یہ چیز اس پر کفر کے فتوے لگانے کے راستے میں رکاوٹ ہوگی اسی طرح علی سبیل الحکایہ کافرانہ عقائد زبان سے ادا کرنا، مثلاً: قرآن کریم میں کفار کی کہی باتوں کی حکایۃً تلاوت کرنا، جبکہ کلام پاک کی تلاوت خود عبادت ہے، یا مثلاً: کوئی گواہ قاضی وقت کے سامنے سنے الفاظِ کفر دہرا کر شہادت ثبت کروائے، وغیرہ وغیرہ تو ایسی شرائط اور رکاوٹیں فتوائے کفر کے آگے حائل ہوتی ہیں، چنانچہ: بات، بے بات کفر کے فتوے جڑ دینے سے گریز رکھنا لازمی شرعی تقاضہ ہے۔

تکفیری سوچ کے بُرے نتائج:

یہ غلط سوچ اور یہ بے راہ نظریہ کہ جس کے نتیجے میں ناجائز خون ہی خون، عصمتوں کی پامالی، مالی لوٹ کھسوٹ، ذاتی اور ملی املاک کا ضیاع، ٹرانسپورٹ اور تعمیرات کا جلاؤ گھیراؤ، کارخانوں فیکٹریوں اور صنعتی اداروں کی تباہ کاری، ملک وقوم کی چولیں ہلا دینے والے ناگفتہ بہ حالات، افراتفری کی خوفناک فضاء اور اس جیسا مزید بہت کچھ امت کا منہ چڑائے... تو یہ سب بالاجماع شرعاً حرام کام ہیں کیونکہ اس میں بے گناہ جانوں کی حرمت کی پامالی ہے، املاک واموال کی حرمت کی

پامالی ہے، امن واستقرار کی حرمت کی پامالی ہے، پر امن اور بے ضرر گھروں تک محدود، اپنے معاش کی فکر لیے، اپنی صبحیں اور اپنی شامیں خاموشی سے جینے والے معصوم انسانوں کی زندگیوں کی حرمت کی پامالی ہے، اور ہر کس وناکس کی بنیادی ضروریات اور عمومی مصالح کی حرمت کی پامالی ہے۔

برادرانِ امت! کیا ہم یہودیوں سے بھی بُرے ہیں کہ جو اپنے گھر کو مومنوں کے ہاتھوں اور خود آگ لگالگا خاکستر کر بیٹھتے ہیں۔ کہ ہماری صفوں میں ٹوٹ پھوٹ اور انتشار اس خطرناک حد کو جا چھولے کہ ہم ایک دوسرے کے دست وگریباں ہوں، دشمنی اور بغض ونفرت کا نشان بن کر رہ جائیں، جیسے جناب عثمان غنی t نے کہا تھا:

واللہ! اگر تم مجھے قتل کر دینے کے درپے ہو ہی گئے ہو تو سن لو کہ میرے بعد تمہارے دلوں سے آپس کی محبتیں اچک لی جائیں گی تم ایک ساتھ نماز باجماعت بھی نہ پڑھو گے، مشترکہ دشمن سے بھی اکٹھے نبرد آزما نہ ہو سکو گے۔

ہمارا بنیادی مقصد مسلم امہ میں پھیلتی اس انارکی کی نشاندہی کرنا ہے، بالخصوص ان حالات میں کہ جب بوجہ اندرونی وبیرونی عوامل واسباب کے مسلمان کی دین پر گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے، ایسے میں غلط افکار ونظریات دلوں میں راہ پکڑتے ہیں، اور جاگزیں ہو کر معاشرے کا ناسور بن جاتے ہیں، اب بیچاری عقلیں اور غافل دل ان افکار کی آماجگاہ اور ان کا شکار ہو کے رہ جاتی ہیں۔

شاعر نے اسیر محبت ہونے کی کہانی یوں کہی:

أَتانی هواها قَبْلَ أَنْ أَعْرِفَ الهوى

فصادفَ قلباً خالياً فتمكنا

عشق سے نابلد تھا کہ اس کی محبت نے مجھے آگھیرا

دل خالی ملا تو ڈیرے جما لیئے

یہ مٹھی بھر بیچارے مسلمان اس علمی بیچارگی کا شکار ہیں تو محض اس لیے کہ علم صحیح سے عاری اور علمائے راسخین سے استفادہ سے محروم رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ مخصوص فکر لا علم طبقوں میں فروغ پاتی ہے کہ جہاں اس کا توڑ پیش کرنے والوں کا فقدان ہوتا ہے، اور یہ بیچارے سادہ لوح مسلمان ان اسباب واندازسے نابلد ہوتے ہیں کہ جو اہل علم کا خاصہ اور پہچان ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ہر کہی سنی بات اور پیش آنے والی ہر صورت و کیفیت کو ہم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کریں، اگر تو اس سے موافق ہے تو عین حق ہے اور اگر ان سے ٹکرا رہی ہے تو بلاشک وہ باطل ہے۔ یہی وہ پیمانہ ہے کہ جس کے ذریعہ ہر قول و فعل اور ہر عقیدہ و نظریہ کو پرکھا جائے گا۔ کہنے والا کوئی بھی ہو...۔

اللہ کی توفیق و تائید سے اہل السنۃ کی یہی پہچان ہے، یہی امتیاز ہے کہ وہ اقوال و عقائد کو کتاب اللہ اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر پرکھتے ہیں، تو یہی تا روزِ قیامت حق پر قائم جماعت ہے۔

ہم یہ کہنے میں کوئی باک نہیں رکھتے کہ ایسے تکفیری نظریات و آراء سے اسلام بالکل مبرأ ہے یعنی کتاب اللہ اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید اور دلیل کے بغیر تکفیر کر دینے سے اسلام بری ہے، کیونکہ یہ نِرے شر ہی شر اور برائی ہی برائی کا سرچشمہ ہے، اور جہاں جہاں بھی بے گناہ لوگ ناجائز مارے جا رہے ہیں، آبادیاں تباہ کی جا رہی ہیں، یہ ایسی دہشتگردی ہے کہ اللہ اور رسول نے اس کی کہیں اجازت نہیں دی، اور اسلام ایسی کسی بھی کارروائی سے مبرأ ہے، بلکہ اللہ و رسول پر ایمان رکھنے والا ہر مسلمان اس سے بری ہے، اس جرم کا مرتکب اپنے اس عمل کو ہرگز ہرگز نیکی اور اسلامی عمل سمجھنے کے دھوکے میں نہ رہے، نہ ہی اسے اسلام اور ان اہل اسلام پر احسان شمار کرے کہ جو ہدایت دینی کے شاہکار ہیں، کتاب و سنت کے سچے پیرو ہیں اور

حبل اللہ المتین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں، اسلامی شریعت اور فطرت سلیمہ اس کے اس عمل کو قطعاً قبول نہیں کرتے۔

سب مسلمانوں پر خواہ کہیں بھی ہوں، کتنے بھی ہوں یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہیں، البر والتقویٰ کی نصیحتوں کا تبادلہ کرتے رہیں، دانائی، نصیحت بھری دعوت اور مجادلہ بالتی ھی أحسن کے ذریعہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ

"وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى"

المائدۃ-2

نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی معاونت کرو۔

ہم بارگاہ الٰہیہ میں اس کے اسمائے حسنیٰ اور صفات علیا کے ذریعہ دعا گو ہیں کہ سب مسلمانوں کو مشکلات و معضلات سے محفوظ رکھے، ان کے احوال کی اصلاح اور معاملات کی درستگی فرمائے۔ ان کے ہاتھوں حق کو سرفراز کرے، وہ یہ سب کرنے کا اہل ہے، اس پر قادر ہے۔ آمین

وصلی اللہ علیہ وسلم علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ أجمعین

## (5) شخصی آزادی کا صحیح مفہوم

الشیخ حماد امین چاولہ حفظہ اللہ

جدیدیت اور مغربیت سے متاثر نئی نسل کے ذہن میں مختلف قسم کی جو غلط فہمیاں پرورش پا رہی ہیں انہی میں سے ایک غلط فہمی "شخصی آزادی" کے تعلق سے بھی موجود ہے۔ عام طور سے جب لوگوں کو اسلامی احکام وآداب کو برتنے اور تقوی یا دینداری اختیار کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو شیطان اس دعوت سے متنفر کرنے کے لیے لوگوں کے ذہن میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ دینداری نام ہے بے پناہ حدود وقیود کا، اسلامی زندگی عبارت ہے شخصی آزدی سے محرومی سے، اسے اپنا کر آزادانہ زندگی کی پر کیف لذتوں اور رنگینیوں سے ناطہ توڑ لینا بڑی بیوقوفی اور نادانی کا کام ہے، اس لیے تم ہرگز اپنے اختیارات سے دست بردار ہونے کے بارے میں نہ سوچنا۔ الغرض اس طرح کی چکنی چپڑی باتیں انسان کے ذہن میں شیاطین الجن والانس دونوں ڈالتے ہیں، اور اس قسم کے تصورات کا غلام بن کر ایک بندہ بزعم خویش آزادانہ من مانی زندگی گزارتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "آزادی" کے معنی ومفہوم کو متعین کرنے میں ایسے لوگ زبردست فریب کا شکار ہیں، حالانکہ معمولی غور وفکر سے ایک عام آدمی "آزادی" کی حدودِ اربعہ کی تعیین کر سکتا ہے۔ عام طور سے فریب خوردہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، جیسے چاہے جیے، اس کی مرضی اور منشا کے مطابق ہی اس کا ہر کام ہو، اس کے ارادوں اور خواہشوں کی تکمیل کی راہ میں کوئی چیز آڑے نہ آئے، یہی ہے آزادی اور یہی ہے خود مختاری۔

آزادی کا یہ مفہوم بظاہر تو بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن عملی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس مفہوم کا سقم واضح ہوتا ہے، مثال کے طور پر آپ اپنی موٹر گاڑی سے جا رہے ہیں، آپ کی خواہش ہے بلکہ ہر سوار کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ پوری تیز رفتاری کے ساتھ چل کر کم

سے کم وقت میں منزل مقصود تک پہنچ جائے، تو کیا ایسی صورت میں آپ راستے میں سامنے پڑنے والے کسی بھی ذی روح کی پرواہ نہ کریں گے؟ سڑک پر آنے جانے والی دوسری گاڑیوں اور راہ گیروں کا خیال نہ کریں گے؟ چوراہوں پر نصب کیے گئے برقی اشاروں اور سگنلوں یا ٹریفک پولس کی ہدایتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے چلیں گے؟ آزادی کو جس معنی میں آج سمجھا جارہا ہے اس کا تو تقاضا بہر حال یہی ہے، لیکن ہر کس وناکس جانتا ہے کہ اس تقاضے پر عمل کرنے والے سوار کا حشر کیا ہوگا، ایسا شخص منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنی اور بہت سارے بے گناہوں کی جان سے کھیل جائے گا۔ ہلاکت، تباہی وبربادی اور خسران دائمی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

یہ مثال اور روز مرہ کی زندگی میں سامنے آنے والی لاتعداد مثالیں اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ انسان کی آزادی بھی فطری طور پر حدود وقیود کی پابند ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جس طرح آپ انسان ہیں اور آزاد وخود مختار ہیں ویسے ہی دوسرے لوگ بھی انہی صفات سے متصف ہیں، اگر آپ کی طرح تمام لوگ مزعومہ آزادی سے فریب کھا کر سڑک پر بے لگام چلنے لگیں تو منٹوں میں کیا ہو جائے گا کچھ کہا نہیں جا سکتا، عالمی سطح پر آزادی کے نام پر افراتفری اور بے اعتدالی کا جو دور دورہ ہے وہ اسی فکر سقیم کا لازمی نتیجہ ہے۔

نام نہاد آزادی کے علمبرداروں سے اگر پوچھا جائے کہ کسی دوکان یا ہوٹل کے لذیذ کھانوں اور مٹھائیوں کو دیکھ کر آپ کے منہ سے رال ٹپکنے لگے اور آپ کا نفس انہیں تناول فرمانے کا شدت سے خواہش مند ہو تو کیا آپ جھٹ اس کھانے پر ہاتھ ماریں گے اور اپنا پیٹ بھر کر چل دیں گے یا اس سے قبل اپنی جیب اور اپنی وسعت کا خیال کریں گے، ایسے ہی کسی کی کوٹھی، لباس، سواری یا اور کوئی چیز آپ کو محبوب ہو اور

آپ کا نفس اسے حاصل کرنا چاہے تو بلا کسی عوض معاوضہ کے آپ اسے اپنے قبضے میں کر لینے کو آزادی سے تعبیر کریں گے؟

مغربی دنیا آزادی کی حمایت میں گلا پھاڑ رہی ہے، وہی مغربی دنیا جو ایک مدت تک مشرقی دنیا کی گردن میں اپنی غلامی کا طوق ڈالے بے رحمانہ گھسیٹتی رہی، اپنے جابرانہ تسلط کو قائم و دائم رکھنے کے لیے لاکھوں انسانوں کو خاک و خون میں تڑپایا، ان کی املاک و جائداد کو خوب خوب لوٹا، ان کے قومی خزانوں کو اپنے یہاں منتقل کر لے گئے، استعلال و استحصال کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی تھیں بروئے کار لائی گئیں، اس وقت نہ حقوق انسانی کی پامالی ہوئی نہ انسان کی شخصی و اجتماعی آزادی پر کوئی آنچ آئی، اور اس کے ساتھ ساتھ آج بھی کئیں مسلم ممالک میں جو انسانی جائز حقوق و آزادی کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں دنیا اس سے اچھی طرح واقف ہے لیکن خاموش ہے۔ اور اس سب کے باوجود آج وہی مغرب "حقوق انسان" کا اپنے آپ کو تنہا علمبردار قرار دیتا ہے اور دنیا کی بقیہ قوموں کی انسانی ہمدردی تک کو شک و شبہہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

اسلام نے پہلے ہی دن سے بنی نوع انسان کو "لا الہ الا اللہ" کی تلقین کی، اس کلمہ کا پہلا جزء "لا الہ" انسان کو ہر طرح کے قید و بند اور غیر اللہ کی غلامی و بندگی سے آزاد قرار دے کر دوسرے جز "الا اللہ" کے ذریعہ اس کو صرف ایک اللہ سے جوڑ دیتا ہے، اس طرح اس کو زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی آزادی عطا کرتا ہے جو دوسروں کی آزادی سے نہ ٹکرائے۔ ایسی آزادی جو اخلاق و آداب کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھے، ایک انسان اپنی زبان اور اپنے دیگر اعضاء و جوارح کے استعمال میں اسی حد تک آزاد ہے کہ اس آزادی سے دوسروں کی آزادی سلب نہ ہوتی ہو۔

عہد نبوی میں ایک نوجوان بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر نبی اکرم ﷺ سے زنا کی اجازت طلب کرتا ہے وہاں موجود لوگ اس کی جرأت پر سخت برہم ہوئے اور

قریب تھا کہ اس کو کوئی سزا دے بیٹھیں، نبی ﷺ نے انہیں روکا اور اس جوان کو اپنے قریب بیٹھایا اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس سے پوچھنا شروع کیا:

بتاؤ کیا تم اس بات کو پسند کروگے کہ کوئی تمہاری ماں کے ساتھ زنا کرے؟

نوجوان فوراً بول اٹھتا ہے: اے نبی ﷺ! میں آپ پر قربان جاؤں، ایسا ہرگز مجھے منظور نہیں، آپ ﷺ فرماتے ہیں: تو ایسے ہی دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں کے ساتھ اس فعل کو پسند نہیں کرتے، پھر آپ ﷺ نے دریافت کیا: کیا تمہاری بیٹی کے ساتھ اگر کوئی یہ حرکت کرے تو تمہیں منظور ہوگا؟ اس کے بعد اس کی بہن، اس کی خالہ اور اس کی پھوپھی وغیرہ کے بارے میں آپ ﷺ اس سے یہی سوال کرتے گئے اور وہ انکار کرتا رہا، اور اللہ کے رسول ﷺ ہر مرتبہ اس سے یہی کہتے کہ دوسرے لوگ بھی ایسے ہی اس عملِ بد کو پسند نہیں کرتے۔ یعنی جس طرح تم ہرگز اس بات کو برداشت نہیں کرسکتے کہ تمہاری ماں، بہن، بیٹی وغیرہ کے ساتھ کوئی غلط حرکت کرے ایسے ہی تم اس قسم کی حرکت کسی بنتِ حواء کے ساتھ کروگے تو وہ بھی کسی کی ماں، بہن، بیٹی ہوگی اور اس کے بیٹے، اس کے بھائی اور اس کے باپ ہرگز اسے برداشت نہیں کریں گے۔

کتنے اچھے اسلوب میں نبی آخر الزماں ﷺ نے اس نوجوان کو سمجھادیا کہ دوسروں کے احساسات وجذبات کو ملحوظ رکھنا کس طرح انسان کو غلط کاری سے محفوظ رکھتا ہے، اسی ضمن میں شخصی آزادی کے غلط مفہوم کے سقم کی نشاندہی بھی ہوگئی، روایتوں میں آتا ہے کہ اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے اس جوان کے لیے دعا فرمائی اور اس طرح جب وہ نوجوان وہاں سے اٹھا تو زنا کی قباحت وشناعت کا نہ صرف قائل ومعترف ہوکر اٹھا بلکہ اس کے نزدیک زنا سب سے مبغوض حرکت قرار پائی۔ (رواہ احمد باسناد جید)

اس طرز پر سوچنے، سمجھنے، اور سمجھانے کی ضرورت ہے، آزادی کے غلط مفہوم کا سہارا لے کر طاغوتی طاقتیں اسلام کو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو اسلام سے الگ تھلگ کرنے کی جو سازشیں رچ رہی ہیں انہیں بے نقاب کرنا اور بہکتے ہوئے قدموں کو مزید آگے بڑھنے سے روکنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، شاعرِ مشرق بہت پہلے ہی ماتم کر چکے ہیں کہ

ے

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچہ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد

## (6) تصویر کشی ایک گھناؤنا جرم جسے بہت ارزاں سمجھ لیا گیاہے ۔

الشیخ خالد حسین گورایہ حفظہ اللہ

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "آپ پر جو بھی زمانہ آئے اس کے بعد والا اس سے شر اور برائی میں بڑھ کر ہوگا" اس کی حرف بحرف تفسیر واضح ہو چکی ہے۔ نیز یہ حقانیت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی ہے کہ شریعت جس چیز سے روکتی ہے اس میں معاشرے کی عفت، عزت، جان، ومال اور دین کی سلامتی کی گارنٹی ہوتی ہے۔ مگر حضرت انسان کب مانے ان شرعی حدود وقیود کو! ضرورتوں مصلحتوں اور حاجتوں کے بھونڈے سہاروں سے اس نے بہت کچھ جو ناجائز تھا اسے جائز کر لیا ہے۔ انہی معاملات میں ایک معاملہ تصویر کشی کا بھی ہے۔ اسلام نے تصویر کو قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے، اور اس کی حرمت کے حوالے سے قطعی نصوص صحیح بخاری و مسلم و دیگر کتب حدیث میں بکثرت موجود ہیں۔ ان نصوص میں محض تصویر کی حرمت کا ذکر نہیں بلکہ تصویر کشی سے پیدا ہونے والے ایک ایک ناسور کا ذکر ہے جس میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ اگر امت اس گھناؤنے جرم میں مبتلا ہو گئی یہ ایک کینسر ہے جو معاشرے کی رگ رگ میں پھیل جائے گا اور بالآخر لاعلاج ہو جائے گا۔ شرعی نصوص میں تصویر کشی کی جو قباحتیں بیان ہوئی ہیں ان میں چند ایک ملاحظہ ہوں:

۱ ": تصویر بنانے والوں کو سب سے سخت ترین عذاب دیا جائے گا" (بخاری و مسلم)

۲ " : تصویر بنانے والے اللہ تعالیٰ کی صفت خلق میں اس کا مقابلہ کرتے ہیں"۔ (ایضا)

۳ " : ایسے لوگ سب سے بڑے ظالم ہیں "(بخاری مسلم احمد)

۴ " : تصاویر بنانے والوں کو روز قیامت حکم ہو گا کہ جو بنایا ہے اس میں روح ڈالو لیکن وہ ایسا نہ کر سکیں گے "(بخاری، مسلم اصحاب السنن)

۵ :رسول اللہ ﷺ تصاویر سے سخت نفرت کرتے تھے اس گھر میں داخل نہ ہوتے جہاں تصاویر پائی جاتیں۔ امام بخاری و مسلم اور اصحاب سنن نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے ایکتکیہ خریدا جس میں تصاویر تھیں، جب نبی کریم ﷺ نے انہیں دیکھا تو دروازے پر کھڑے ہو گئے اور گھر میں داخل نہ ہوئے، سیدہ عائشہ فرماتی ہیں میں نے ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار محسوس کر لئے۔ تو کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ "میں اللہ اور اس کے رسول کے حضور توبہ کرتی ہوں میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اس تکیہ کا کیا ماجرا ہے؟ میں کہنے لگی: "میں نے اسے آپ کیلئے خریدا ہے تا کہ آپ اس پر بیٹھیں اور ٹیک لگائیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا "یہ تصویریں بنانے والوں کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا، اور انہیں کہا جائے گا: اسے زندہ کرو جو تم نے پیدا کیا اور بنایا ہے۔"

۶ " : اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوتی ہیں "۔(بخاری و مسلم)

۷ " : تصویریں بنانے والے دنیا کی سب سے بدترین مخلوق ہیں "۔(بخاری و مسلم، نائی)

۸ : تصویروں کو مٹانے اور توڑنے کیلئے رسول اللہ ﷺ نے قاصد روانہ کئے "سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ابی ھیاج الاسدی سے کہا کیا میں تمہیں اس مشن پر روانہ نہ کروں جس پر رسول اللہ ﷺ نے مجھے روانہ کیا تھا۔ کہ کسی تصویر کو نہ

چھوڑنا کہ اسے مٹا دینا اور کسی قبر کو جو زمین سے بلند ہو اسے زمین کے برابر کر دینا۔"
(صحیح مسلم)

۹ " : اللہ تعالیٰ نے تصویر بنانے والوں پر لعنت کی ہے"۔

۱۰ : روز قیامت جہنم سے ایک گردن نکلے گی جس کا مقصد تین قسم کے افراد ہوں گے ۔جن میں ایک تصویر کشی والا بھی ہو گا۔(سنن ترمذی)

انسانی وجود کے رونگٹے کھڑے کر دینے والی وعید پر مشتمل ان نصوص کے باوجود جب انسان عجیب وغریب تأویلات کے ذریعے تصویر کو جائز قرار دے اور معاشرے میں اس کے رواج کا باعث بنے تو یہ کتنی ہی لاپرواہی کی بات ہے۔

اگر اسی امر کا جائزہ ایک دوسرے پہلو سے لیا جائے اور دیکھا جائے کہ جن علل اور وجوہات کی بنا پر تصویر حرام کی گئی ہے۔کیا یہ علتیں اور وجوہات فوٹو گرافی تصویر میں بھی پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ویسے تو مسلمان کسی شرعی نص جس میں تحریم کی وضاحت آ گئی ہو اتنا زیادہ علل وحکمتوں پر زور نہیں دیتا لیکن لیطمئن قلبی کے ضابطے کے تحت ان حکمتوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

پہلی علت: مضاھاۃ خلق اللہ

اللہ تعالیٰ کی صفت خالق میں مشابہت اختیار کرنے کی سعی جیسا کہ روایت میں ہے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ کون ہے بدبخت جو مجھ جیسی مخلوق بناتا ہے۔اب ایک عاقل غور کرے کیا مضاہاۃ خلق اللہ فوٹو گرافری میں نہیں پائی جاتی فرق محض آلہ اور ہاتھ کا ہوتا ہے۔

دوسری علت: شرک کے پھیلنے کا خدشہ

جیسا کہ قوم نوح کی بابت وارد ہوا کہ ان میں شرک انہی تصویروں کی وجہ سے شروع ہوا یہی خدشہ آج بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

تیسری علت: وثنیت اور مظاہر شرک سے امت محمدیہ کو دور رکھنا
جیسا کہ ام حبیبہ اور ام سلمہ کی روایت میں مذکور ہے کہ جب وہ حبشہ میں ایک کلیسا میں داخل ہوئیں تو وہاں تصویریں اور تماثیل پائیں۔ اور سابقہ امتوں میں شرک اسی تصویر سازی کے ذریعے داخل ہوا تھا۔ اسلام نے یہ چاہا کہ اس کا راستہ بند کر دیا جائے۔

چوتھی علت:
اس میں مشرکین سے مشابہت ہے۔ تصاویر بنانا اہل شرک کا وطیرہ ہوا کرتا تھا اور آج بھی ہے۔

پانچویں علت:
اس میں اسراف اور فضول خرچی کا پہلو پایا جاتا ہے۔ جو کہ کیمرہ سے حاصل کردہ تصاویر میں بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ آج کی دنیا میں دیکھیں کہ کیمروں کی قیمت ہزاروں سے لاکھوں میں جا چکی ہے۔ مہنگی ترین موبائلز کی مہنگائی کی بنیادی وجہ یہی کیمرے اور ان میں موجود تصویری صلاحیت ہے۔
یہ سرداً چند علتیں ہیں اگر انہیں ملحوظ رکھ لیا جائے تو اس فقہی قاعدہ
" "الحکم یدور مع علتہ وجوداً وعدماً"

حکم وجود وعدم کے اعتبار سے اپنی علت کے گرد گھومتا ہے" کے مطابق بھی کیمرہ کی آنکھ سے لی گئی تصاویر حرام ٹھہرتی ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

کیا فوٹو گرافری والی تصاویر حرمت میں اس حکم میں داخل ہیں۔

بعض اہل علم نے اس بحث کا بالخصوص تذکرہ کیا ہے کہ فوٹو گرافری کی تصاویر اس حکم میں داخل نہیں جس کی وہ درج ذیل توضیحات بیان کرتے ہیں۔

ا: ایک روایت پر اعتماد ہے جس میں ہے

"الا رقما فی الثوب"

کہ کپڑے پر چند نقش کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

۲: یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں مضاہاۃ خلق اللہ بھی نہیں پائی جاتی اس لئے جائز ہے۔

۳: اس کی مثل ایک سایہ کی ہے۔ جیسا کہ انسان آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہے۔

یہ اور اس طرح کے چند کمزور اعتراضات اور حیل وحجت بیان کر کے فوٹو گرافری کی تصویر کی اس سے مستثنیٰ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اگر حقیقت حال کو دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ استدلال کئی ایک وجوہات کی بنا پر درست نہیں۔

اولا: فوٹو گرافی کی تصویر کو مسمی تصویر سے نہیں نکال سکتے کیونکہ اسے بھی تصویر ہی کہا جاتا ہے اور اسے کھینچنے والے کو بھی مصور ہی کہا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ حرمت میں دیگر تصاویر سے کچھ درجہ کم ہو گی لیکن یہ چیز اسے حد حرمت سے نہیں نکال سکتی۔ اور اگر جواز کی صورت ہے بھی تو وہ انتہائی اشد ضرورت کی صورت میں۔

دوم: ہاتھ سے بنائی جانے والی تصویر سے زیادہ مفاسد فوٹو گرافری کی تصویر میں موجود ہیں جس پر ذیل میں مختصر نظر ڈالی جاتی ہے۔

تصویر سے ہونے والے مفاسد:

۱: نسل نو کی تباہی کی ذمہ دار تصویر ہی ہے چاہے وہ ویڈیوز کی صورت میں ہو یا فوٹوز کی صورت میں۔ نوجوان نسل کو بے راہ روی پر گامزن کرنے والی، ان میں بے حیائی اور بد فعلی کے جذبات کو برانگیختہ کرنے والی اور اشتعال پیدا کرنے والی یہی تصویر سازی ہی ہے۔

۲: اخلاق اور دین کی تباہی اسی تصویر سازی کے ذریعے ہوتی ہے۔

۳: وثنیت اور بت پرستی اور شرک کا ذریعہ بھی تصویر ہی ہے۔ بالکل وہی طریقہ کار ہی جیسا کہ سابقہ امتوں میں ہوتا تھا کہ کسی قوم میں اگر ان کا ایک بزرگ اور نیک ہستی فوت ہو جاتی تو اس کی تصاویر بنا لیتے پھر انہی تصاویر کی بعد ازاں پرستش شروع ہو جاتی۔ آج کے دور میں بھی دیکھ لیجئے پیر پرستی کے جال میں پھنسے لوگ اپنے پیروں کی تصاویر جیب میں رکھتے ہیں اپنے موبائلز میں رکھتے ہیں۔ حتی کہ ہم نے حرم مکہ و مدینہ میں مشاہدہ کیا کہ لوگ دوران عبادت اپنے پیروں کی تصاویر لئے ان سے عقیدت کا اظہار کرتے پائے گئے۔

۴: عزتوں اور عفتوں کی تباہی کا باعث ہے۔

آئے روز اخبارات میں کتنے حادثات وواقعات پڑھنے کو ملتے ہیں کہ خواتین کو جعلی تصاویر کے ذریعے بلیک میل کیا گیا۔ عزتیں لوٹی گئیں۔ قتل ہو گئے۔ ہمارا معاشرتی نظام شکست وریخت کا شکار ہو گیا محض اس تصویر کشی کے باعث۔

۵ : عبادات کا ضیاع اور ریاکاری کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ حاجی اتنا مال ومتاع خرچ کر کے مکہ مکرمہ جاتا ہے اور وہاں عبادت کے دوران بھی سیلفی میں مشغول ومگن رہتا ہے۔ دوران طواف جو وقت ذکر واذکار و تسبیح کا ہے وہ سیلفی میں گذرتا ہے۔ اب اگر یہ ریاکاری نہیں تو کیا ہے۔

۶ : اس فعل محرم کا ارتکاب اب بیوت اللہ میں ہونے لگا ہے۔ اب مساجد میں بے دریغ تصاویر بنائی جاتی ہیں کوئی روکنے والا نہیں۔

۷ : معصیت انسان کے ساتھ ہر لمحہ مصاحب ہے۔ نماز میں ہے تو اس کی جیب میں تصاویر اور ویڈیوز کی شکل میں بیشمار ویڈیو کلپ موجود ہیں۔ اگر چل رہا ہے تو اس میں مشغول، لیٹا ہے تو اسی شغل میں لگا ہے، بیٹھا ہے تو بھی وہی حال ہے۔ الامان و الحفیظ

۸ : لوگ گھروں میں آویزاں کرتے ہیں۔

۹ : غم کو زندہ رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ شریعت کا ایک مقصد یہ ہے انسان غم کو بھلا دے اللہ تعالیٰ کے فرمان کا مفہوم ہے "جو ہاتھ سے نکل جائے اس پر غم زدہ نہ ہو"۔ اسلام کا مقصد ہے انسان غم کو بھلا دے اور قضائے الٰہی پر راضی رہے۔ اور اس غم کے احیاء کے تمام ذرائع ختم کر دئے گئے اس لئے تین دن سے زیادہ افسوس اور غم منانے سے منع کیا گیا

لیکن آج اگر ایک انسان کا بیٹا فوت ہوتا ہے تو اس کے باپ کے پاس اس کی تصویروں کے ڈھیر سارے البم موجود ہوتے ہیں باپ، ماں یا دیگر رشتہ دار جب ان تصویروں

کو دیکھتے ہیں تو ان کے زخم ایک بار پھر ہرے ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ مصاحبت غم مقاصد شریعت کے خلاف نہیں

۱۰ : تصویر غلو اور غیر اللہ کی تعظیم کا باعث ہے۔

۱۱ : اسراف اور تبذیر کا پہلو بدرجہ اتم موجود ہے۔

۱۲ : التشبہ بالکفار و مشرکین ہے۔

ان تمام مفاسد کو اگر سامنے رکھا جائے تو دل اسی چیز پر مائل ہوتا ہے۔ تصویر کشی ایک ناسور ہے جس سے جان چھڑائے بغیر معاشرے کی اصلاح بہت مشکل نظر آتی ہے۔ یہ عجلت میں چند صفحات لکھنے کی اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ان شاء اللہ آئندہ کسی موقع پر اس موضوع پر مفصل تحریر لکھی جائے گی اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

## (7) الحاد کا مفہوم

فضیلۃ الشیخ حافظ محمد شریف حفظہ اللہ

دین اسلام کی تعلیمات سے نفرت، قرآن وسنت کی تعلیمات سے بیزاری اور اس کے اندر قرآن وسنت کے لیے شکوک وشبہات پیدا ہوجائیں اس کے اندر یہ چیزیں داخل ہونا شروع ہوجائیں کہ قرآن مجید تو اللہ کی کتاب اور وحی ہے لیکن جو حدیث وسنت کے نام سے ہمارے علماء نے اس کو اسلام میں داخل کرنے کی سعی کی ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ شاید کسی دور میں یہ لکھی ہوئی کتاب جس کا نام "دو اسلام" تھا وہ اسی نظریے پر لکھی گئی تھی کہ ایک اسلام تو قرآن ہے تو اس اسلام کے مقابلے میں حدیث اور سنت کا اسلام کہاں سے آگیا۔ محدثین کی عظیم محنتوں سے قائم کردہ اصولوں پر صحیح ثابت ہونے ہونے والی احادیث کو کوئی شخص محض یہ کہہ کر رد کردے کہ میری عقل اس کو نہیں مانتی، یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے یہ تین سو سال بعد میں لکھی گئی ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس شخص کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے اندر الحاد پرزور طریقے سے آچکا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قرآن نے صرف ہماری آخرت کی کامیابی کیلئے کچھ اصول بتائے ہیں لیکن دنیا کے اندر اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں قرآن کو چھوڑنا پڑے گا، قرآن کی تعلیمات سے ہمیں آزادی حاصل کرنی پڑے گی، قرآن ہمارے لیے ترقی کی راہ میں بندش اور رکاوٹ ہے، جس طرح یورپ نے اپنے مذہب کو چھوڑا تو انہوں نے ترقی کی جب تک ہمارے سامنے یہ قرآن اور اس کے حقوق اور پابندیاں رہیں گی، رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور احادیث کو ہم اپنے لیے بندش بنا کر رکھیں گے اتنی دیر تک ہم دنیا میں ترقی نہیں کرسکتے۔ گویا قرآنی تعلیمات، سنت رسول ﷺ، دینی

احکامات کو اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے وہ شخص بھی بری طرح الحاد کی بیماری کا شکار ہو چکا ہے۔

الحاد کی یہ ایک بہت واضح صورت ہے کہ انسان کو اللہ کی ذات کے بارہ میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں اللہ کیا ہے؟ وہ کس سے پیدا ہوا ہے؟ اس کی صفات کیا ہیں؟ کیا وہ بول سکتا ہے؟ جب اس کی ذات کے بارہ سوچنا شروع ہو جائیں اور فطرتی انداز کو چھوڑ کر صرف اپنا عقلی انداز اختیار کیا جائے تو اتنا بڑا الحاد انسان کے اندر آتا ہے پھر وہ یہ سمجھتا کہ اللہ تعالیٰ دیکھ بھی نہیں سکتا کیونکہ دیکھنے کے لیے آنکھ بمعہ بصارت چاہیے اللہ تعالیٰ سن بھی نہیں سکتا اس کے لیے کانوں کے اندر سماعت کے پردے ہونے چاہیے جس کو اللہ کی ذات کے بارہ میں یہ شک و شبہ شروع ہو جائے کہ اللہ ذوالجلال بول نہیں سکتا، بولنے کے لیے زبان اور دانت، حروف کے مخارج کی ضرورت ہے یہ سب صفات اللہ ذوالجلال کی نہیں ہو سکتیں اس لیے اللہ تعالیٰ بول نہیں سکتے یہ الحاد کی ایسی شکل ہے کہ جس خالق نے ہمیں پیدا کیا تھا جس نے یہ ساری صفات ہمیں عطا فرمائیں تھی اور جس نے بولنے کی طاقت ہمیں عطا فرمائی اور ہم کمزور مخلوق اللہ کے بارہ میں فیصلہ کرنا شروع کر دیں کہ اللہ تعالیٰ بول سکتا ہے یا نہیں، کہ رحمان ہے رحمت کرتا ہے یا نہیں، اللہ تعالیٰ اعمال کو تول سکتا ہے یا نہیں، دیکھ سکتا ہے یا نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿٧٨﴾

یٰس-78

اللہ تعالیٰ اپنے بارہ میں فرماتا ہے کہ میں رحمان، رحیم، سمیع، بصیر بھی ہوں، بولتا بھی ہوں اور عرش پر ہوں اللہ کی صفات کا انکار اس سے بڑا الحاد اور کیا ہو سکتا ہے۔ بعض

لوگ اس الحاد کا شکار ہوئے، عقل پرستی کی بنیاد پر یہ سوچ بیٹھے کہ ہر چیز ہی اللہ ہے یہ جو صوفیہ کا عقیدہ ہے جو ہمارے معاشرے میں بڑی کثرت سے پھیلا۔ امام ذہبی سیر اعلام النبلاء میں ابن عربی کے عقیدہ کے بارہ میں فرماتے ہیں "اگر وحدۃ الوجود کا عقیدہ کفریہ اور الحادیہ عقیدہ نہیں تو میں نہیں جانتا کہ دنیا میں کوئی کفر یا الحاد ہو۔"

اسی طرح اللہ کے بارہ میں کلمہ پڑھنے والے یہ سوچنا شروع کر دیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی مرضی سے پیدا فرمایا اور ہمارے اندر خواہشات، علم، سمع و بصر پیدا کیں اور ان سب پر پابندیاں لگا کر کے اپنا پابند بنانا چاہتے ہیں، الحاد صرف اللہ تعالیٰ کے بارہ میں ہی نہیں آیا بلکہ رسول اللہ ﷺ کے بارہ میں بھی ایسا ایسا الحاد کلمہ پڑھنے والوں کے اندر آیا کہ آپ کے نکاح اور شادیوں سے متعلق موضوع بحث بنایا جاتا ہے میں اس بات سے حیران ہوں کہ آج کل جتنے اعتراضات محمد ﷺ کی ناموس پر کلمہ پڑھنے والوں نے کیے اور کر رہے ہیں ایسے اعتراضات اس دور کے مشرکین نے بھی نہیں کیے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح اللہ کے حکم سے ہوا، خواب کے اندر ان کی شکل دکھائی گئی جیسا کہ یہ واقعہ صحیح بخاری کے اندر ہے اب نکاح ہوا کسی کافر، منافق، مشرک نے یہ اعتراض نہیں کیا تھا کہ ایک بڑی عمر، چھوٹی عمر ایسے نازیبا الفاظ اور اعتراضات جس کو ہماری زبان بیان کرنے سے قاصر ہے، آج ریسرچ کے نام پر کلمہ پڑھنے والے جن کی زندگی کا مشن یہ تھا کہ وہ آپ کے ہر حکم کے سامنے کہتے رہیں سمعنا و أطعنا، اگر عمل کا وقت نہ بھی آیا ہو تو کہتے تھے ہم نے سن بھی لیا اور مان بھی لیا اللہ کے رسول ﷺ کی ذات گرامی کو علم کے نام پر تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے علم کے نام پر صحابہ کرام اور آپ کی ازواج مطہرات پر انگلیاں اٹھائی جا رہی ہیں ان کے کردار اور سیرت کو موضوع بحث بنایا

جارہا ہے کیوں؟ اس لیے کہ یہودیوں کو یہ بغض وعداوت تھی کہ آخری پیغمبر بنو اسحاق سے آنا چاہیے اور یہ بنو اسماعیل سے آیا اب ان کی پوری کوشش ہے کہ ہم ان کی تعلیمات کو، کوششوں کو اور غلبہ اسلام کی اس تحریک کو ہر طریقے سے اس کو بدنام کرنے کی کوشش کریں یہ دراصل وہ یہودی بغض ہے اسلام کے خلاف، رسول اللہ ﷺ کے خلاف، اسلام کے گواہ آپ کے پہلے شاگرد اور جن کے ہاتھ پر اللہ ذوالجلال نے عدل فرمایا تھا ان پر طعن و تشنیع دراصل یہ اللہ کے رسول پہ طعن ہے کہ جو شخص اپنی پوری زندگی میں چار کے علاوہ کسی کو مسلمان نہ بنا سکا جو مسلمان خواتین اپنے گھر نہ رکھ سکا اور یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جن خواتین کے ساتھ رات بسر کرتے رہے جب تک آپ کی شرمگاہ کو جہنم کی آگ سے پاک نہیں کیا جائے گا اس وقت تک جنت میں داخلہ ممکن نہیں؟ (نعوذ باللہ من ذلک)

ہم پھر بھی بڑے پیار و محبت سے ان کو اسلام کا سرٹیفکیٹ بھی دینا چاہتے ہیں، ہم ایسے ملحدین کے ساتھ شامل ہو کر شاید نظریہ پاکستان کا تحفظ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ الحاد، شکوک و شبہات سے بھی پیدا ہوتا ہے اللہ کے بارہ میں نازیبا گفتگو سے بھی پیدا ہوتا ہے رسول اللہ کی ذات گرامی کو موضوع بحث بنانے سے بھی پیدا ہوتا ہے اور ان کی احادیث سے انکار سے بھی پیدا ہوتا ہے اور الحاد کی بہت شکلیں ہیں اس سے بڑا الحاد کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم جو صرف ایک اللہ کی بندگی اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیتا ہے ہم اس سے بدعات، خرافات اور شرکیہ افعال اور غلط عقائد کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، پورے انبیاء کی تعلیم صرف لا الہ الا اللہ یعنی کلمہ توحید ہے۔

اخلاص للہ: لوگ اس کا معنی کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس لیے سلف صالحین نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ لا معبود بحق الا اللہ۔

اس لیے کہ معبود تو دنیا میں لوگوں نے بہت بنائے پتھر، شرمگاہ، عورت، ستارہ و آگ کو بھی معبود بنایا لیکن سچا معبود صرف ایک ہی ہے جو اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ اس سے بڑا الحاد کیا ہو سکتا ہے کہ ہم نے ہر ایک کو معبود بنا دیا اور ہر باطل کو معبود حق بنا لیا انسان کو نماز سے نفرت ہو جائے اور کہے یہ وقت کا ضیاع ہے اگر اتنا وقت ہم کاروبار میں لگائیں تو ہم اسے دگنا کما سکتے ہیں۔ داڑھی نہ رکھنا گناہِ کبیرہ ہے، اور اس سے نفرت کرنا، نیز حلال ذرائع کو عمداً چھوڑ کر جھوٹ کے سہارے کو اپنایا جائے مجھے تو بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ داڑھی تو سنت العادۃ ہے سنت العبادۃ نہیں جو صاحبان قرآن وسنت کی دعوت دینے والے ہیں آج وہی اس چیز کی دعوت دے رہے ہیں کہ آزادی چاہیے، پردہ خواتین کی ترقی میں رکاوٹ ہے تو آپ سمجھ لیں اس شخص کے اندر الحاد آیا ہے اور یہ الحاد درجہ بدرجہ بھی ہو سکتا ہے بعض صورتوں میں انسان مرتد ہو جاتا ہے، مسلمانوں کے اندر جو الحادی فکر آ رہی ہے یعنی دین سے انحراف، دین سے بغاوت، دین سے نفرت اس کے اسباب مختصراً ذیل میں مذکور ہیں:

پہلا سبب: ہم نے کلمہ پڑھا اسلام قبول کیا لیکن بغیر شعور کے کہ اسلام کا معنی و مفہوم کیا ہے؟ کلمہ توحید کے اقرار کرنے کے بعد مجھے اپنے عقائد و نظریات میں کیا تبدیلی کرنی ہے؟ آپ ﷺ کی گواہی کے بعد مجھے اپنے عمل اور دنیا کے تمام شعبوں میں کیا انقلاب پیدا کرنا ہے؟ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ارد گرد سارے مسلمان ہیں چلو میں بھی مسلمان ہو جاتا ہو۔ پروفیسر حافظ عبد اللہ بہاولپوری رحمہ اللہ کے پاس کچھ دوستوں نے ایک عیسائی شخص کو پیش کیا اور حافظ صاحب سے عرض کی کہ اس کو کلمہ پڑھاؤ یہ مسلمان بننا چاہتا ہے حافظ صاحب نے اس سے کچھ سوال پوچھے کہ آپ اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین کیوں

اختیار کر رہے ہو تمہارے دین میں کیا کمی ہے اس نے جواباً عرض کیا کہ مجھے ان چیزوں کا پتا نہیں۔ حافظ صاحب نے کہا کہ اسے لے جاؤ اور سمجھاؤ کہ اسلام کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ سمجھانے کے بعد اگلے جمعہ دوبارہ لے آئے حافظ صاحب نے تغیر دین کا سبب دریافت کیا تو اس نے کہا مجھے نہیں پتا، تیسرے جمعہ میں لے آئے تو دریافت کرنے پر اس نے کہا سیدھی سی بات ہے کہ ہمارے گاؤں میں سارے مسلمان ہیں، سارا دن محنت مزدوری کرتے ہیں اور شام کے بعد گاؤں کے بازاروں کے چوارہوں پر سارے ساتھی جاتے تازہ حقہ وہاں میسر ہوتا ہے سارے مسلمان دن کی تھکاوٹ دور کرتے ہیں باتیں کرتے ہیں اور ہنسی مذاق کرتے اور حقہ پیتے ہیں اور جب میں جاتا ہوں تو مجھے کہتے ہیں کہ یہ عیسائی ہے اسے حقہ نہیں پینے دینا تو میں چاہتا ہوں کہ مسلمان ہو کر ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں تاکہ مجھے حقہ پینے سے نہ روکیں تو حافظ صاحب کہنے لگے اسے لے جاؤ حقہ پینے والے مسلمان تو پہلے بھی کافی ہیں۔ اس کی فکر فکرِ اسلامی بنا کر لاؤ میں آپ سے سوال کرتا ہوں اس کائنات میں کتنے فیصد مسلمان ہیں جو لا الہ الا اللہ کا مفہوم اور محمد رسول اللہ ﷺ کی گواہی کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ جب صلح حدیبیہ کا معاہدہ نامہ لکھا جا رہا تھا تو اس میں لکھا گیا کہ:

ھذا ما تقاضا علیہ محمد رسول اللہ

سہیل بن عمرو اسی وقت چیخ اٹھا اس نے کہا کہ محمد الرسول اللہ ﷺ نہیں لکھو بلکہ محمد بن عبد اللہ لکھو کیونکہ

لو نقول أنک رسول اللہ لاتبعناک

اگر آپ کے ساتھ جھگڑا ہے تو وہ ہے ہی محمد کے بعد رسول اللہ کا، اگر ہم کہیں کے آپ محمد کے ساتھ رسول اللہ بھی ہیں تو پھر ہمیں آپ کے پیچھے چلنا پڑے گا۔ آج ہم رسول اللہ ﷺ کے نام کی تسبیحیں بھی نکال رہے ہیں اور کہتے ہیں ٹھیک ہے رسول اللہ کی حدیث ہو گی لیکن میں پہلے اپنے آپ سے پوچھوں گا میں تو فلاں امام سے پوچھوں گا سب سے پہلا جو سبب مسلمانوں کے اندر الحاد کا آیا، وہ یہ ہے کہ ہم نے اسلام کو سمجھ کر نہیں پڑھا ہے۔

دوسرا سبب کہ کلمہ پڑھنے، اسلام میں داخل ہونے کے بعد ہم نے قرآن وسنت کی تعلیم کو باقاعدہ حاصل نہیں کیا کتنے فیصد مسلمان ہیں جو کہتے ہیں ہم سنی ہیں اور سنی کا معنی سن سنا کر مسلمان ہونا۔ لفظ کا معنی ہی بگاڑ دیا۔ کتنے فیصد ایسے مسلمان ہیں جنہوں نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہے، ناظرہ پڑھا، صحیح بخاری پڑھی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی رقمطراز ہیں: سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں قراء اور اکابر صحابہ کو بڑے بڑے شہروں میں بھیجا کہ جو بھی اسلام قبول کرتا ہے اسے قرآن اور سنت رسول ﷺ کی تعلیم دو، ان کو قرآن کا ایک حصہ حفظ ہونا چاہیے جو کہ ان کی ضرورت ہے انہوں نے ایک کمیٹی بنائی تھی جو سارے شہروں، گاؤں میں ان کا امتحان لیتی تھی کہ اگر کسی کو قرآن یاد نہیں ہوتا تھا، رسول اللہ ﷺ کی حدیث یاد نہیں ہوتی تھی نماز کا صحیح طریقہ نہیں آتا تھا تو وہ ان کو تعزیری سزا دیتے۔ ہمارے اس معاشرے میں الحاد بڑے زور وقوت سے پھیل رہا ہے کیونکہ علم وتربیت تو ہوتی نہیں، اب جہاں قرآن وسنت کا نور اور روح نہیں ہو گی اس کے اندر شکوک وشبہات، وسوسے ڈالنا اور اس کو گمراہ کرنا بہت آسان ہو گا۔

تیسرا سبب الحاد کا یہ ہے کہ ہمارا میزان تعلیم، پاکستان کا نظام تعلیم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو رائج ہے معذرت کے ساتھ اگر یہ بات عرض کرو کہ ہمارے دین

مدارس جو کہ دین کے قلعے ہیں، اس میں ہم سال میں کتنے نوجوان سندِ فراغت دیکر معاشرے کے سپرد کرتے ہیں؟ صرف 5 فیصد، باقی 95 فیصد نوجوان کہاں جاتے ہیں؟

فیصل آباد کے تمام دینی مدارس کے اندر میں نے ایک دفعہ تعداد کا اندازہ لگایا تو 1200 یا 1500 تھی صرف ہمارے پورے مدارس میں تو باقی نوجوانوں کو کون پڑھا رہا ہے اور ان کو کیا پڑھایا جا رہا ہے ان کو مخلوط تعلیم کون دے رہا ہے؟ الحاد کا سبب دنیاوی شعبے بھی ہیں کہ ہم سب مال، شہرت، زندگی کا اسٹیٹس اونچا کرنے کے لیے ان شعبوں میں مگن ہو جائیں اور دینی تعلیم ہی حاصل نہ کریں کتنے ایسے لوگ دیکھے جنہوں نے صرف اس لیے رسول اللہ کے بارہ میں زبان کھولی کہ یورپ ان کو اقامہ دے دے گا اور باہر جا کر ان کو برطانیہ، امریکہ، یورپ کی شہریت مل جائے گی انکا روزگار بلند ہو جائے گا۔

الحاد کا آج کے دور میں بہت بڑا سبب میڈیا ہے اور یہودیوں کا یہ نظریہ ہے کہ ہر چیز علم کے ذریعے اپنے عقل پر پرکھیں کہ وہ علم کی اساس پر اترتا ہے یا نہیں قرآن وسنت کے مسلمہ عقائد کو بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے۔

یہ جو اظہار رائے کی آزادی ہے دراصل عقل پرستی ہے عقل کا غلبہ ہی رائے کا غلبہ ہے اپنے آپ کو وحی کے تابع نہ رکھنا اپنے عقل سے قرآن کو ٹھکرانا، حدیث رسول رد کرنا، اور اپنی عقل سے الحاد کے تمام دروازے کھولے۔

یہ نہ سمجھنا کہ عقل کمزور ہے، عقل خطرناک چیز ہے۔

یاد رکھو اللہ کی بغاوت اسی رائے کی وجہ سے ہے اسی عقل پرستی کی وجہ سے ہے جیسا کہ اللہ رب العزت نے فرمایا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو تو عقل نے کہا میں اس کو کیسے سجدہ کروں یہ تو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور میں تو آگ سے بنایا گیا ہوں

اللہ کے حکم کے سامنے قیاس، رائے اور عقل کو آگے کیا۔ عقل پرستی کی وجہ سے ہی ہمارے معاشرے میں الحاد آیا۔

الحاد کا ایک بہت بڑا سبب علماء، مساجد اور دینی مدارس کو بدنام کرنا بھی ہے کہ ان لوگوں کا کام سوائے لوگوں پر کفر کے فتوے اور جہنمی قرار دینے اور کیا ہے پاکستان کو فتنوں کی آماجگاہ بنانے والے یہی علماء کرام ہیں۔ اس قسم کی بدنامی کا ماحول بنا کر لوگوں کو دین اور علما سے متنفر کیا جائے جب دین سے دور ہونگے، علماء سے دور ہونگے تو ان کے پاس الحاد اور ارتداد ہی واحد راستہ بچتا ہے۔ ہمارے ساتھی نے پچھلے دنوں سروے پیش کیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ 98 فیصد پاکستان میں جو دھماکے کرنے والے پکڑے گئے ہیں ان کا تعلق کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ہے۔ لیکن یہ لوگ ذرائع اور میڈیا کو استعمال کر کے اسلام اور اہل اسلام کو بدنام کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

یہ موٹے موٹے اسباب ہیں جس کی وجہ سے اس معاشرے میں الحاد پھیلا۔

الحاد کا سدباب:

کچھ لوگ الحاد، بے دینی، دین سے بغض و نفرت اختیار کرنے والے منافقین ہیں انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھا ہے لیکن اسلام کو بدنام کرنے کیلئے۔

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا

البقرۃ-10

لیکن جو عمومی مسلمان ہیں ان کو کیسے الحادی فکر سے بچائیں گے سب سے پہلی بات وہ یہ ہے کہ جب تک ہم اسلام، قرآن اور سنت کی تعلیم سے آراستہ نہیں کریں گے اس وقت تک ہم الحاد اور بے دینی کا سدباب نہیں کر سکتے الحاد یا تو بغض و نفاق کی وجہ سے آتا ہے یا جہالت کی وجہ سے آتا ہے کہ انہیں حقیقت کا پتا نہیں

ہوتا تو ہمیں چاہیے کہ ہم بھرپور طریقے سے تحریک چلائیں صرف مدارس میں ہی نہیں بلکہ مساجد میں دوران تعطیلات کالج اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کو چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھائیں کوئی مسجد اور فیکٹری ایسی نہیں ہونی چاہیے جس میں قرآن کا ترجمہ، صحیح بخاری کی ایک حدیث کا ترجمہ نہ پڑھایا جائے اگرچہ ان کے پاس میڈیا کا پلیٹ فارم ہے احساس کمتری کا شکار نہ ہوں بلکہ ہمارے ہاں مساجد کی صورت میں پلیٹ فارم موجود ہے اگر خطبۂ جمعہ کو صحیح تیاری کے ساتھ پڑھایا جائے تو ہم صرف ایک دن میں لاکھوں لوگوں کو دین کی دعوت پہنچا سکتے ہیں۔ سلف صالحین کے دروس اور حلقات مساجد میں ہی ہوا کرتے تھے۔ اور نبی کریم ﷺ کی تعلیم و دعوت کیا ہوا کرتی تھی فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

**البقرۃ-129**

کوئی صحابی عقیدہ سے منحرف نہیں ہوا کوئی جہمی ہوا ہو، قدریہ کا شکار ہوا ہو کیوں ایسی بدعت کے شکنجے میں نہیں آئے کیونکہ انہیں خالص کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے بہرہ ور کیا گیا تھا۔ تو ہمیں ایسے اسکول اور مراکز تعمیر کرنے کی ضرورت ہے کہ جس میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث و توحید کے مضامین کی تعلیم دی جائے۔ کچھ ساتھیوں نے ایسے مراکز قائم کیے وہ الحمد للہ بصورت احسن ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔

ہم اپنے آپ کو اسوۂ بنا کر کے لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ نبی کریم ﷺ کا چالیس سالہ دورہ یہی تھا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾

**یونس-16**

إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحْمِلُ الكَلَّ، وَتَكْسِبُ المَعْدُومَ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الحَقِّ

صحیح البخاری:3

اللہ رب العزت خالص اسلام پر استقامت عطا فرمائے اور دعوت دینے کی توفیق عطا فرمائے اپنے آپ کو اسوۂ اور نمونہ بنائیں۔ آمین

## (8) آزادئ اظہارِ رائے کے شرعی اصول وضوابط

الشیخ خالد حسین گورایہ حفظہ اللہ

اہل عقل وفہم کے ہاں ایک مسلّمہ امر ہے کہ علماء، حکماء، مفکرین جب بھی "آزادئ اظہار رائے" پر لب کشائی کرتے ہیں تو سب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اظہار رائے کی یقیناً کوئی حد یا باؤنڈری ہونی لازمی ہے، تاکہ فتنہ وفساد اور معاشرتی عدم توازن کے نظام کو کنٹرول کیا جاسکے۔ ہاں اس کی قید کے پیمانے ہر ایک کے ہاں مختلف ہیں بعض لوگ اس پر عرفِ عام، یا معاشرتی اقدار کی روک لگاتے ہیں، بعض اسے آئین وقانون سے مقید کر دیتے ہیں، اور بعض دیگر ے یہ کہتے ہیں کہ جہاں دوسرے کے مفادات کو ٹھیس پہنچتی ہے، اس کی دل آزاری ہوتی ہے وہاں آپ کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ بعض نے اخلاقی فساد وبگاڑ کو آزادئ رائے کی حد بندی بتایا ہے۔ الغرض دنیا کا کوئی بھی ذی عقل انسان اس حقیقت کا انکاری نہیں ہے کہ آزادئ رائے کو لازماً کسی حد وقید میں رکھنا ضروری ہے۔ رائے میں مادر پدر آزادی کا مطلب محض شر وفساد کی آبیاری ہے۔

اسی مسلّمہ ضابطہ کو سامنے رکھتے ہوئے ہر قوم، ملک، نسل اور آبادی نے اپنے معتقدات، اپنی عادات واعراف، اور مصالح وقوانین کے تحفظ کیلئے اس آزادی کو ایک دائرہ تک محدود رکھا ہوا ہے۔

آزادئ اظہارِ رائے کا تطوراتی مفہوم:

انسان آج سے نہیں بلکہ ہزاروں سالوں سے اس دنیا میں بس رہا ہے، ہر دور میں اس نے اپنی آزادی کیلئے کچھ قاعدے وضع کئے مگر اس کی فلاح اور کامیابی محض اسلام کے دئے گئے ضابطہ آزادی سے ہی ممکن ہو پائی ہے۔ کرہ ارض پر قدیم ترین تہذیبوں میں مصری تہذیب نمایاں ہے۔ قدیم مصری تہذیب میں آزادی کا جو تصور

پایا جاتا تھا وہ بعینہ اپنی اُسی پرانی شکل میں جدید دنیا میں بھی موجود ہے اگرچہ انداز، کردار، واطوار بدل گئے ہیں اغراض ومقاصد واہداف وہی پرانے ہیں۔

مصر کی عہد قدیم کی آزادی کچھ ایسی ہوا کرتی تھی کہ محض فرعون کو آزادی تھی! فرعون اکیلا ہی جو چاہتا، جب چاہتا اور جس کیفیت سے چاہتا کرتا تھا، ہاں رعایا کو کوئی آزادی نہیں تھی بلکہ وہ وقت کے بادشاہ کے اشارے کے تابع تھے جسے انہوں نے خدائی درجہ دے رکھا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی آزادی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

يَا قَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَن يَنصُرُنَا مِن بَأْسِ اللَّهِ إِن جَاءَنَا ۚ قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ ﴿٢٩﴾

**غافر-29**

فرعون نے کہا، میں تو تمہیں وہی رائے دے رہا ہوں جو خود دیکھ رہا ہوں اور میں تو تمہیں بھلائی کی راہ ہی بتلا رہا ہوں۔

یعنی وہ بزعم خود سمجھ رہا تھا کہ میری ہی رائے صحیح ہے باقی سب غلط۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَاتَّبَعُوا أَمْرَ فِرْعَوْنَ ۖ وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ ﴿٩٧﴾

**هود-97**

پھر بھی ان لوگوں نے فرعون کے احکام کی پیروی کی اور فرعون کا کوئی حکم درست تھا ہی نہیں۔

فرعونی تہذیبوں میں فرمانروا ہی سیاہ وسفید کے مالک ہوا کرتے تھے، اِبلاغ وترسیل کے تمام ذرائع پر حکومت اور بالانشیں طبقوں کا مکمل کنٹرول تھا۔ اخبارات اور صحافیوں کے پیروں میں حکومت اور مقتدر طبقے نے پابندیوں کی زنجیر ڈالی

ہوئی تھی، وہ کوئی ایسا مواد مشتہر نہیں کر سکتے تھے، جس میں حکومت اور فرماں روائے وقت یا حکومتی اہل کاروں کی پالیسیوں پر جرح و تنقید کی گئی ہو۔

آج کے دور میں آزادئ اظہار رائے کے حوالے سے فرعونی تہذیب کا ترجمان کمیونسٹ نظریہ ٔابلاغ ہے جو اشتراکیت کے عروج کے دنوں میں کافی موضوعِ بحث رہا۔

کمیونسٹ نظریہ ٔابلاغ میں اظہار رائے اور فکر و نظر کی آزادی کو حکومت کی پالیسیوں کی تشہیر تک محدود کر دیا گیا تھا۔ ذرائع ابلاغ اس بات کے پابند تھے کہ وہ عوام میں جا کر انھیں حکومت اور پارٹی کی پالیسیوں سے آگاہ کرائیں اور مملکت کے بنیادی نظریے یعنی کمیونزم کی تشہیر کریں اور اس نظریے کو اپنانے کے لیے عوام کی ذہن سازی کریں۔ مطلب یہ کہ کمیونسٹ نظریہ ٔابلاغ بھی کسی نہ کسی شکل میں مقتدرانہ نظریہ ٔابلاغ کا ہی چربہ تھا۔ اس میں بھی عوام مجبور و مقہور اور مہر بہ لب تھے۔

مغربی فکر و سوچ پر بھی یہی اصولپندر ہویں سولہویں صدی تک حاوی رہا اور تمام ذرائع ابلاغ و دیگر حکومتی تحویل میں رہے۔ افلاطون نے اسی نظریے کو پسند کیا اور کہا: "اگر ریاست میں اختیارات کو بہت سے افراد میں تقسیم کر دیا جائے تو ریاست کا زوال شروع ہو جاتا ہے، اس لیے حاکم کو چاہیے کہ ریاست کے انتظام میں عوام کے عمل دخل کو محدود کر دے۔"

عالمِ حاضر اور مغرب کی فکری آزادی:

فرعونی آزادئ اظہار رائے کے مقابلے میں یورپ میں اس کے بالکل برعکس نظریے نے جنم لیا اور وہ تھا مادر پدر آزادی کا نظریہ۔ جہاں فکر و نظر کی اور کردار و عمل کی مکمل آزادی دے دی گئی۔ اظہار کی آزادی کی آڑ میں ذرائع ابلاغ کے سرکش گھوڑے کو ایسا بے لگام چھوڑ دیا گیا جس نے ایمانیات کے ساتھ انسانوں کی

اخلاقیات کو بھی پیروں تلے روند کر دکھ دیا۔ یہ نظریہ آزادی پسندانہ نظریہ ابلاغ کے طور پر تاریخ میں جانا گیا، چونکہ اس عہد میں سائنسی دریافتوں نے انسان کو عقلیت کا سبق سکھایا تھا اور وہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ہی اس کو اپنی زندگی میں روبہ عمل لاتا تھا، اس لیے انھوں نے ماقبل کے نظام حکومت میں عائد قید و بند سے آزادی کے لیے ایک ایسے نظریے کا سہارا لیا، جس میں فرد کو ساری آزادی میسر تھی۔ آزادی پسندانہ نظریہ ابلاغ کو امریکی حکمرانوں نے خوب شہہ دی اور سب سے پہلے امریکی دستور میں یہ ترمیم کی گئی کہ کانگریس کوئی ایسا قانون نہیں بنائے گی، جس سے تحریر و تقریر اور ذرائع ابلاغ کی آزادی پر حرف آتا ہو۔ کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے حکمراں طبقوں نے اس نظریہ کو اپنے ملکوں میں خوب پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ مقتدرانہ نظریہ ابلاغ میں تمام اختیارات ریاست اور حکمراں طبقے کو حاصل تھے، اس کے برعکس آزادی پسندانہ نظریہ ابلاغ میں ہر فرد کو یہ آزادی دی گئی تھی کہ وہ جو چاہے، جس طرح چاہے اور جس کے خلاف چاہے تقریر اور تحریر کے سہارے اس کا اظہار کر سکتا ہے۔ مملکت یا حاکم وقت کو اس کے دست و بازو کو پکڑنے اور اس کو مہر بہ لب کرنے کا حق نہ ہوگا۔

یہ جرأت اس انتہا کو پہنچ گئی کہ مقدس مقامات، شخصیات، انبیاء کرام بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ انہوں نے عظیم الشان ہستی جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی جارت کی، جبکہ اس سے قبل دیگر انبیاء کرام جناب یوسف علیہ السلام، جناب عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ کی شخصیات کے فلمی کردار پیش کئے۔ یہ سب کچھ اسی آزادئ اظہار رائے کے فلسفے کو بنیاد بنا کر ہوتا رہا، واعجبا!

آزادی اظہار رائے کا یہ ناسور جب مغرب کے رگ وریشہ میں رچ بس گیا تو یہ نظریہ مغرب نے محض اپنی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ دیگر اقوامِ عالم کو بھی اس کے ذریعے مسخر کیا۔ اور آج آپ اندازہ کر سکتے ہیں مسلمانوں و دیگر اقوام عالم کی مغرب کے سامنے بے بسی کی وجہ یہ شتر بے مہارانہ آزادی ہے۔ مغرب نے ایسے شاطرانہ طریقے سے امم عالم کو فکر و نظر اور اظہار رائے میں آزاد کیا کہ اس وقت دنیا میں بالعموم اور عالم اسلام میں بالخصوص جتنی بھی سورشیں برپا ہیں، جتنی بھی افراتفری اور بے یقینی کی کیفیت ہے سب اس آزادی اظہار رائے اور میڈیا کی شتر بے مہار آزادی کے باعث ہے۔

میخانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں

لاتے ہیں سرور اوّل، دیتے ہیں شراب آخر

عالم حاضر میں اس بے لگام آزادی کے باوجود چونکہ انسانی فطرت سے تو ہر مسلم و کافر کا پالا پڑتا ہے، اس سے خلاصی ممکن نہیں لہٰذا ہر قوم و ملک کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ آزادئ اظہار رائے پر (چاہے وہ جزوی ہو) روک لگائی جائے ورنہ کوئی قوم اس کے بغیر نہ ترقی کر سکتی ہے نہ فساد کو کنٹرول کر سکتی ہے۔ اسی فطری ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے جدید تہذیب نے بھی کچھ ایسے قوانین و اصول وضع کئے ہیں جن کی رو سے ان کے ہاں چند مسائل پر گفت و شنید کرنا، کسی قسم کی رائے کا اظہار کرنا شجرہ ممنوعہ قرار پاتا ہے۔ جیسا کہ قوانین بین الاقوام اس کے شاہد ہیں۔

یورپی کنونشن کا چارٹر (مجریہ 1950، روم) آزادی اظہار رائے کی روک کو قانونی حیثیت بھی عطا کرتا ہے۔ جس کی رو سے آزادئ خیالات کے ان حقوق پر معاشرے میں موجود قوانین کے دائرہ کار کے اندر ہی عمل کرنا ہوگا، تاکہ یہ آزادیاں کسی دوسرے فرد یا کمیونٹی کے

تحفظ، امن وامان اور دیگر افراد یا کمیونٹی کے حقوق اور آزادیوں کو سلب کرنے کا ذریعہ نہ بنیں۔

مزید برآں اسی چارٹر کے سیکشن 1، آرٹیکل 10 کی شق اول و دوم میں یہ بھی درج ہے کہ "آزادئ اظہار کے حوالے سے ملکی قوانین پامال نہیں کئے جائیں گے، تاکہ جمہوری روایات علاقائی سلامتی، قومی مفادات، دوسروں کے حقوق کی پاسداری اور باہمی اعتماد کو نقصان نہ پہنچے۔"

' "آزادی اظہار کا یہ تصور فرض شناسی اور ذمہ دارانہ رویے سے مشروط ہے۔"

' "آزادئ اظہار کا حق نہایت حزم واحتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ استعمال کیا جانا چاہئے، اس کے ذریعے کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ملک میں معاشرے کی اخلاقی اقدار، دوسروں کی عزتِ نفس، اور ان کے بنیادی حقوق کو گزند پہنچائے۔"

آزادئ اظہار کا یہ حق 'انٹرنیشنل کنونشن آن سول اینڈ پولیٹکل رائٹس ICCPR' کے ذریعے بھی محدود کر دیا گیا ہے

ہیومن رائٹس کمیشن کے ایک مشہور کیس Faurisson VS France کا عدالتی فیصلہ ملاحظہ ہو:

' "ایسے بیانات پر جو یہودیت دشمن جذبات کو ابھاریں یا انہیں تقویت دیں، پابندیوں کی اجازت ہوگی، تاکہ یہودی آبادیوں کے مذہبی منافرت سے تحفظ کے حق کو بالادست بنایا جاسکے۔"

ہولوکاسٹ پر لب کشائی کرنا بہت سے ممالک میں قابل سزا جرم ہے۔ حتیٰ کہ بعض یورپی ممالک میں ہولوکاسٹ کے انکار پر 20 سال قید کی سزا مقرر ہے۔

سابق الذکر ان دونوں نظریات کو بعینِ عدل دیکھا جائے تو یہ افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔ کسی مہذّب سماج اور انسانی معاشرے میں نہ تو کسی فرد کو مکمل اظہار کی آزادی دی جا سکتی ہے کہ وہ شُترِ بے مہار بن جائے اور آزادی اظہار کے پردے میں دوسروں کی دل آزاری کا سبب بنے، حرمات و مقدّسات کی پامالی کا مرتکب ٹھہرے اور لوگوں کی نجی زندگی کے بارہ میں لب کشائی کرے۔ اور نہ ہی انسانوں کی فکر و نظر کی آزادی کو بے جا قانون و اصول کا سہارا لے کر اس طرح قید و بند کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے فطری اور پیدائشی حق کے لیے بھی آواز بلند نہ کر سکیں۔

اسلام اور آزائ اظہار رائے:

ہر مسلمان کلمہ شہادت "أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم" پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا معترف بنتا ہے۔ عبودیت کا مطلب ہوتا ہے بندگی، غلامی گویا کہ بندہ یہ اعتراف کرتا ہے کہ اے اللہ میں اپنی تمام زندگی تیری غلامی میں بسر کروں گا۔ اب غلامانہ زندگی کیسی ہوتی ہے؟ ہر ذی شعور فرد اس سے بخوبی واقف ہے۔ زمانہ حاضر میں جہاں انسان نے مادی زندگی میں ترقی کی ہے اس ترقی کو بنیاد بنا کر حضرت یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ شاید اخلاقی، تہذیبی، مذہبی، ثقافتی اقدار بھی بدل چکے ہیں اس لئے ان میں بھی تبدیلی ضروری ہے۔ انہی اقدار میں ایک آزادی اظہار رائے بھی ہے۔ میڈیا کی ترقی اور عروج کے بعد ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے اظہار رائے کا حق حاصل ہے۔ وہ اپنی رائے میں آزاد ہے، جو چاہے کہے! جیسا چاہے عقیدہ رکھے! لوگوں کو اس کا قائل کرے اور اپنی سوچ و فکر کا ہمنوا بنائے۔

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

مغرب نے حریت پر قانونی ضابطے لاگو کئے مگر دینی اور اخلاقی ضابطوں سے لوگوں کو آزاد کر دیا۔ اسی بنیاد پر مغرب میں دین کو دنیا سے الگ کر دیا گیا اور "أعطوا مالقیصر لقیصر ومالله لله" کا نعرہ لگایا۔ مگر اسلام میں حریت اور آزادی کا مفہوم لوگوں کو مخلوقاتِ کائنات کی عبودیت سے نکال کر اللہ رب العزت کی عبودیت میں لگانا ہے۔ اس لئے واقعہ قادسیہ کے موقع پر جب رستم نے مغیرہ بن شعبہ سے پوچھا کہ آپ لوگ ہمارے علاقوں میں کس لئے آئے ہیں تو آپ فرمانے لگے:

"لإخراج العباد من عبادة العباد إلى عبادة الله"

البداية والنهاية: ج7ص43۔44

لوگوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں لگانے آئے ہیں۔

اسلام کرہ ارض پر موجود ادیان ومذاہب، تہذیبوں اور ثقافتوں پر آزادئ اظہار رائے کی حفاظت ورعایت کے تمام اعلیٰ ضابطوں کے تعین میں سبقت لے جا چکا ہے۔ اس لئے کہ یہ فطری دین ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے صحیح اور حقیقی آزادی محض وہی ہے جو باری جل وعلا نے اپنی کتابوں اور اپنے رسولوں کے ذریعہ واضح فرمادی ہے ۔ لیکن جہالت کے انتشار کے باعث لوگ آزادی کو اس کے اصل مفہوم سے ہٹا کر اور سمت لے گئے ہیں۔

مغربی فکر میں آزادئ رائے کو محض اس پیرائے میں محصور کر دیا گیا ہے کہ آپ سے کسی کو نقصان یا تکلیف نہ پہنچے۔ انہوں نے یہ ضابطہ متعین کیا کہ "آپ کی آزادی میرے نقصان کی حد پر ختم ہو جاتی ہے"۔

اس حوالے سے سگریٹ نوشی کی مثال لے لیجئے! مغربی نظریہ کے مطابق آپ اپنے گھر میں آزاد ہیں چاہے جتنی مرضی سگریٹ نوشی کریں، ہاں آپ باہر مجمعے

میں کسی اور کے سامنے سگریٹ نہ پئیں کیونکہ اس سے دوسرے کو تمباکو کی آمیزش سے تکلیف ہوتی ہے۔

بہت سے مسلمان بھی شخصی آزادی کا مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھ پائے اور وہ بھی مغربی فکر کی مغلوبیت و مرعوبیت کے باعث آزادی کا دائرہ کسی دوسرے کے نقصان پر محدود کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ انسان اپنے آپ کو چاہے جتنا نقصان پہنچا سکتا ہے پہنچائے غیر کو اس سے کوئی قدغن نہیں لگنی چاہئے۔

اسی ضابطے کو سامنے رکھتے ہوئے لوگ کہنے لگ گئے ہیں کہ میرے سامنے کفریہ کلمات مت کہیں، ہاں تنہائی میں آپ جو مرضی کریں! اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اس کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی توہین کریں آپ آزاد ہیں۔ والعیاذ باللہ

الغرض مغربی آزادی کسی دوسرے کے نقصان سے مقید ہے۔ جہاں کسی غیر کو زک پہنچے آپ کی آزادی کا دائرہ وہاں ختم۔ اس لئے انہوں نے اعتقادات میں آزادی دے رکھی ہے۔ کہتے ہیں آپ جو چاہیں عقیدہ رکھیں، کسی پتھر، درخت، بجلی کے پول، جسے چاہتے ہیں اسے خدا بنائیں۔ یہودی ہوں، عیسائی ہوں، بدھ مت ہوں، سکھ ہوں انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن اس طرح کی اعتقادی آزادی کی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔ اسلام لوگوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اِلٰہ واحد کے سامنے جھکیں، خود کو اس کے سپرد کر دیں کیونکہ وہی ان کا مالک، خالق اور رازق ہے فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٨٥﴾

آل عمران: 85

''اور جو شخص اسلام (فرمانبرداری) کے سوا کوئی اور دین چاہے تو اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ نے کتنی قوموں کو شرک کے باعث صفحہ ہستی سے مٹادیا۔ قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم شعیب۔ اسلام کا اس حوالے سے ضابطہ واضح ہے۔ وہ کفر اور الحاد کی آزادی نہیں دے سکتا۔ ہاں اسلام ہر کسی کو اسلامی آداب کے اندر رہتے ہوئے اظہار رائے کی آزادی دیتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ اس کا واضح شاہد ہے کہ آپ نے منبر پر خطبہ دیا اور لوگوں کو حقِ مہر میں مبالغہ کرنے سے منع فرمایا، ایک عورت نے آپ سے کہا کہ آپ حق مہر میں مغالبے سے کیوں منع فرمارہے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿٢٠﴾

**النساء:20**

’’اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو اور تم نے اسے خواہ ڈھیر سا مال دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ کیا تم اس پر بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کے مرتکب ہو کر اس سے مال لینا چاہتے ہو؟‘‘

یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے:

"أصابت المرأة وأخطأ عمر"

اسلامی خلفاء و ملوک اور تاریخ اسلام سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ، ص 12

عورت نے صحیح کہا اور عمر سے غلطی ہوئی۔ پھر آپ نے دوبارہ خطبہ دیا اور اپنی سابقہ رائے سے رجوع کیا۔

نامور عالم دیں حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں ”خلفاء راشدین نے اپنے کو تنقید سے بھی بالاتر نہیں سمجھا اور اظہارِ رائے پر قدغن نہیں لگائی۔ وہ پانچوں وقت خود عام لوگوں کی امامت کراتے اور جمعہ و عیدین کے موقعے پر لوگوں سے براہِ راست خطاب فرماتے

۔یُوں ہر شخص کے لیے ان پر تنقید کرنا اور ان کو روکنا ٹوکنا ممکن اور آسان تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ حکمرانوں کا عوام کی دسترس سے بالا رہنا یا انہیں اظہارِ رائے سے محروم رکھنا یہ اسلام کے نظامِ خلافت سے مطابقت نہیں رکھتا"

اہل علم فرماتے ہیں:

"الغرب قيد الحرية فقط أن لا تضر بالآخرين، فالحرية في الإسلام قيدها أيضا ألا تضر بنفسك"

مفهوم الحرية بين الإسلام والجاهلية، للشيخ علي بن نايف الشحوذ. ص 18

مغرب نے آزادی کو محض اس اصول سے مقید کیا ہے کہ آپ کسی اور کو نقصان نہ دیں جبکہ اسلام نے اسے اس ضابطہ سے مقید کیا ہے کہ آپ اپنے آپ کو بھی نقصان نہ دیں۔ اسلام کو آپ کی صحت، آپ کی جان، آپ کی عزت اور آپ کے مال کی حفاظت آپ سے زیادہ عزیز ہے۔

جیسا کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لا ضرر ولا ضرار"

سنن ابن ماجه: كتاب الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره

' 'نہ کسی کو ابتداءً نقصان پہنچایا جائے اور نہ بدلے میں"۔

ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لا ضرر ولا ضرار، من ضار ضره الله، ومن شاق شق الله عليه"

المستدرك على الصحيحين: كتاب البيوع

' 'جو کسی دوسرے کو نقصان پہنچائے اللہ اس کو نقصان پہنچائے اور جو دوسرے پر سختی کرے اللہ اس پر سختی کرے"۔

اسلام میں مطلق العنان نام کی کسی قسم کی آزادی نہیں، بلکہ ہر آزادی کو مقید کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ قید کے بغیر صالح اور فاسد کی تمیز ممکن نہیں۔ ایک مسلمان کو یہ بات تصور میں بھی نہیں لانی چاہئے کہ اسے مادر پدر رائے کی آزادی دی جائے!۔ اسلام کہتا ہے کسی اور کو بھی نقصان نہ دو اور اپنی ذات کو بھی نقصان نہ پہنچاؤ۔ اس لئے اسلام نے شراب، سگریٹ نوشی، جوا، سود، خنزیر کھانے سے منع کیا کہ اس سے انسان کی اپنی ذات کو نقصان پہنچتا ہے۔ الغرض اسلام انسانیت سے ہمدردی رکھتا ہے ۔بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نادانی میں جب آزادئ رائے کی بات کرتے ہیں، تو اس میں کفر کی آزادی بھی دے جاتے ہیں، یعنی حریت فکر، اور حریت کفر دونوں اصطلاحوں کو یکجا کر جاتے ہیں اسلام نے فکر کی آزادی دی ہے لیکن کفر کی نہیں مگر بعض ناداں نام نہاد مسلمان حریت فکر کو بنیاد بنا کر حریت کفر کی بھی اجازت دے دیتے ہیں۔

الغرض ہم مسلمان ہیں ایک مسلم کی حیثیت سے سوچیں کہ کیا ہم رائے کے اظہار میں آزاد ہیں؟ یا شرعی طور پر ہم پر کچھ پابندیاں ہیں جنہیں خاطر میں لانا ضروری ہے۔

اسلام میں آزادئ اظہارِ رائے کے اصول وضوابط:

پہلا اصول: اسلام نے کس میدان میں اظہار رائے کی آزادی دی ہے؟

جو بھی حکم، فیصلہ، یا مسئلہ شرعی نصوص سے ثابت ہو، چاہے اس کا تعلق عبادات ومعاملات سے ہو یا حدود وتعزیرات سے یا پھر خانگی اور عائلی معاملات سے اس بارے میں اسلام نے حکم دیا ہے کہ اس کے خلاف اظہار رائے کی کوئی گنجائش نہیں۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا ﴿٣٦﴾

**الاحزاب-36**

’’اور (دیکھو،) کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ سزاوار نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول (ان کے بارے میں) کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو (وہ اپنی رائے کو دخل دیں اور) اس معاملے میں ان کا (اپنا) اختیار (باقی) رہے۔ اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔‘‘

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے کسی فیصلے پر رائے زنی تو کجا اس سے متعلق دل میں کجی رکھنا بھی انسان کو ایمان سے دور کر دیتا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

**فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾**

**النساء-65**

’’پس (اے پیغمبر،) تمہارے رب کی قسم، یہ (کبھی) مومن نہیں (ہو سکتے) جب تک کہ اپنے باہمی جھگڑوں میں یہ تمہیں حَکَم نہ بنائیں اور جو فیصلہ آپ کر دیں اس سے اپنے دلوں میں ذرا بھی تنگی نہ پائیں اور (دل و جان سے اس کو) تسلیم نہ کر لیں۔‘‘

قرآن و سنت کے دلائل اور ائمہ سلف کا اتفاقی فیصلہ ہے کتاب و سنت کے کسی فیصلے پر نقد کرنا اسے رد کرنا جائز نہیں جو ایسا کرے گا گویا وہ حق سے نکل گیا اور اس نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش کی جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١﴾**

**الحجرات-1**

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرتے رہو (کیونکہ) وہ (سب کچھ) سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔‘‘

تمام آراء کو کتاب وسنت پر پیش کیا جائے گا جو ان کے موافق ہو گی لے لیا جائے گا جو مخالف ہو گی اسے رد کر دیا جائے گا۔

امام ابو الزناد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

**"إن السنن لا تخاصم، ولا ينبغي لها أن تتبع بالرأي والتفكير، ولو فعل الناس ذلك لم يمض يوم إلا انتقلوا من دين إلى دين، ولكنه ينبغي للسنن أن تلزم ويتمسك بها على ما وافق الرأي أو خالفه."**

**الفقيه والمتفقه، للخطيب البغدادي 392/1**

شرعی ثوابت وسنتوں سے متعلق تنقید وتردید کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور یہ کسی طرح بھی روا نہیں کہ رائے محض اور پراگندہ فکر سے ان کی بیخ کنی کی جائے، اگر لوگوں کو اس کی آزادی دے دی گئی تو ایک دن بھی ایسا نہیں گزرے گا کہ لوگ ایک دین سے دوسرے دین میں منتقل ہو جائیں گے، مگر شرعی سنن کے حوالے سے ضروری یہ ہے کہ ان کی پیروی کی جائے اور ان پر عمل کیا جائے چاہے وہ رائے کے موافق ہوں یا مخالف"۔

اس لئے اسلام میں اظہار رائے کو کتاب وسنت اور اجماع امت کے ماتحت کیا گیا ہے کوئی بھی انسان اپنی رائے کا اظہار کرتے وقت کسی مصلحت کو بنیاد بنا کر ایسے نتائج لاتا ہے جو کتاب وسنت کے خلاف ہوں تو گویا اس نے شریعت اسلامی سے ناگواری کا اظہار کیا اور اسے خوش دلی سے قبول نہیں کیا۔

اس لئے اہل علم نے یہ قواعد وضع کئے ہیں کہ:

**لا اجتهاد في موارد النص**

**شرح القواعد الفقهية، للزرقا ص147**

نصِ شرعی کی موجودگی میں اجتہاد جائز نہیں۔

**وان ما عارض النص فاسد الاعتبار**

**آداب البحث، للشیخ محمد الأمین الشنقیطی، 129/2**

جو بات بھی نصِ شرعی کے خلاف ہوگی وہ ناقابلِ اعتبار ہوگی۔

مگر صد افسوس ہم اگر اس وقت مسلم معاشرہ کا جائزہ لیں تو اس میں شرعی ثوابت کو بھی طعن و تنقید اور رائے کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ جس میں شرعی حدود ،ایک سے زائد شادیاں، خواتین کی وراثت کا مسئلہ، خواتین کی آزادی، پردے کے مسائل وغیرہ، شرعی نصوص سے ثابت شدہ ان تمام معاملات کو زیر بحث لا کر اسے مختلف طریقوں سے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے جو قطعاً غیر شرعی عمل ہے اور انسان کو کفر میں بھی مبتلا کر سکتا ہے!۔

دوسرا اصول: صاحب رائے کون ہونا چاہئے؟

رائے کے اظہار کرنے والے کیلئے اسلام نے کڑی شرط لگائی ہے کہ وہ صاحب علم ہونا چاہئے اگر کوئی علم سے ہٹ کر بات کرتا ہے اس کی کوئی وقعت وحیثیت نہیں ۔فرمان باری تعالیٰ ہے:

**وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿٣٦﴾**

**الاسراء-36**

’ ’اور (دیکھو،) جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگو۔ (یاد رکھو،) کان، آنکھ اور دل ان سب سے (قیامت کے دن) باز پرس ہونی ہے۔“

**وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿١١٦﴾**

**النحل-116**

’’اور نہ کہو جو تمہاری زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، کہ اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ باندھنے لگو۔ (یاد رکھو،) جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کبھی فلاح پانے والے نہیں۔‘‘

س سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ جو شخص جس فن کا ماہر ہے وہ اسی فن میں بات کرے، اپنے فن سے ہٹ کر اگر اس سے رائے لی جائے تو اسے چاہئے کہ اس بات کو اس فن کے ماہرین کے سپرد کر دے۔ جیسے طب کے مسئلہ میں کسی انجینئر کی بات کی کوئی حیثیت نہیں تو اسی طرح شرعی مسئلہ میں کسی غیر عالم اور کسی دنیاوی فن کے ماہر کی رائے کا کوئی وزن نہیں ہے۔ اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ

"یشرع الحجر علی المتطبب الجاھل"

**القواعد النورانیہ الفقھیۃ، ص 151،152**

اطائی معالج پر پابندی لگانا ضروری ہے۔ اگر دنیاوی شعبہ جات کے لوگ ایک دوسرے کے شعبہ کا احترام کرتے ہیں تو پھر شرعی معاملات و مسائل میں اس احترام کو کیوں درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا؟ کیا دین اتنا ہی لاوارث ہے کہ جسے جو من میں آئے وہ کہہ دے۔ اللہ کے بندو اللہ کا خوف کرو۔ جو شعبہ سب سے حساس ہے اس میں غلط رائے زنی انسان کو کفر تک لے جا سکتی ہے ہم نے اسے اتنا ہی ارزاں بنا کر ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کیلئے میدان کھول دیا ہے کہ وہ شرعی مسائل میں ببانگ دہل اپنی جہالت جھاڑتا پھرے۔ میڈیا کی شتر بے مہاری کے باعث ہمارے چینلوں پر مذہبی پروگرام چند مسخروں، بھانڈوں، مداریوں، گویوں، اداکاروں اور کاسہ برداروں کے حوالے کر دئے گئے ہیں۔ بقول ڈاکٹر ضیاء الدین ’’مذہب کے نام پر روایت اور دین کے نام پر خرافات بانٹنے کا سلسلہ ہر جگہ جاری ہے۔ نہ ایمان

سنہ عقیدہ، سنہ کعبہ، سنہ امام، سنہ مقتدی، سنہ رمضان، سنہ امان۔ سارے فُقرے، بھوکے ننگے، چھٹل کار توس، بڑے عمامے، کھوکھلے سر، چینلوں پر آنے کے شائق، رونمائی کی ہوس کے مارے ہوئے منافق، ستر برس میں سترہ برس کے دکھائی دینے کے شوقین، حلق سے قاف نکالنے اور حلق تک افطاری ٹھونسنے والے شکم پرور، دین کو مداری کی مرضی سے موڑنے توڑنے اور جوڑنے والے کاریگر، پیسے لے کر فتوے دینے والے چھابڑی بردار، سب چینلوں پر جمع ہیں، جبکہ اصل علماء مساجد اور مدارس میں عبادت اور تدریس میں مصروف ہیں۔

یہ مختصر سا نقشہ ہے جس میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اس وقت میڈیا پر دینی معاملات میں رائے دینے والے کن صفات و معیارات کے حامل ہیں۔ الّا ماشاء اللہ

اسلام نے رائے کے حوالے سے علم کے ساتھ ایک ضابطہ یہ بھی متعین کیا ہے کہ اظہار رائے میں ارادہ خیر و حق ہونا چاہئے۔ نہ کہ محض اظہار رائے اور خود نمائی کا جذبہ۔ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے"۔

تیسرا اصول: رائے کے نتائج کو مد نظر رکھنا بھی ضروری ہے

بسا اوقات اس طرح کی صورت حال بن جاتی ہے کہ رائے دہی اصلا تو جائز ہوتی ہے اس میں کوئی شرعی مخالفت نہیں ہوتی لیکن حالات اس طرح کے درپیش ہوتے ہیں کہ اس موقع پر اظہار رائے سے فتنہ کے در آنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اور اس کے در پردہ بہت سے مفاسد اور نقصانات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ شریعت مطہرہ کا بنیادی مقصد و مدعیٰ فساد و نقصانات کا خاتمہ ہے لہذا اس

بنا پر کچھ مواقع و محل ایسے ہوتے ہیں کہ رائے جائز ہونے کے باوجود اس کے اظہار سے گریز کرنا چاہئے۔ اسی بنا پر اہل علم نے ایک قاعدہ وضع کیا ہے:

)سد الذرائع المفضية إلى الفساد(

جو بھی ذرائع فساد پر منتج ہوتے ہیں انہیں روکا اور ختم کیا جائے گا۔

شریعت میں اس کی مثالیں موجود ہیں

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کو محض اس وجہ سے قتل نہیں کیا تھا کہ کہیں لوگ یہ نہ کہنے لگ جائیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے ہی لوگوں کو قتل کر رہے ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مفتی حضرات کو وصیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"على المفتي ان يمتنع عن الفتوىٰ فيما يضر المسلمين ويثير الفتن بينهم، وله ان يمتنع عن الفتوى إن كان قصد المستفتي كائناً من كان نصرة هواه بالفتوى وليس قصده معرفة الحق واتباعه."

مجموع الفتاوى، 198/28

' 'مفتی کو چاہئے کہ ایسا فتویٰ دینے سے گریز کرے جو مسلمانوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے یا ان کے مابین فتنہ و شر انگیزی کا باعث بنے۔ ایسی صورت میں وہ قطعا فتویٰ صادر نہ کرے چاہے مستفتی کوئی بھی ہو اس سے اس کی غرض اپنی خواہش اور رائے کی نصرت ہے نہ کہ حق کی پہچان اور اس کی اتباع۔"

اظہار رائے کے نتیجہ کے حوالے سے وقت کا بہت اہم کردار ہوتا ہے کہ انسان جب اپنی رائے دے رہا ہے اس وقت ماحول اور حالات کیسے ہیں؟ اس کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ میں جن لوگوں سے مخاطب ہوں کیا میری بات صحیح سمجھ بھی پائیں گے یا نہیں؟

صحابہ کرام سے بھی متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے بہت سے مسائل میں خاموشی اختیار کی اور اظہار رائے سے اجتناب کیا۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لایا اور کہنے لگا کہ فلاں آدمی یہ کہہ رہا ہے کہ اگر عمر فوت ہو گئے تو میں فلاں کی بیعت کر لوں گا۔ یہ بات سن کر عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ میں آج رات لوگوں سے خطاب کروں گا اور انہیں ایسے لوگوں کے بارے میں متنبہ کروں گا جو ان کی خلافت ہتھیانے کے چکر میں ہیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے جب یہ بات سنی تو عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے امیر المومنین آپ ہرگز ایسا نہ کیجئے گا!۔ کیونکہ یہ حج کا موقع ہے جس میں کم عقل، ہنگامہ پرداز اور عامۃ الناس بھی اکٹھے ہیں۔ اور جب آپ خطاب کیلئے کھڑے ہوئے تو یہ لوگ آپ کی مجلس پر حاوی رہیں گے، مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ آپ کوئی ایسی بات کہہ دیں جو صحیح طرح ان کو سمجھ نہ آئے اور یہ لوگ اسے لے اڑیں اور اسے اس کا صحیح مقام نہ دیں۔ لیکن آپ جب مدینہ منورہ تشریف لے جائیں تو وہ دار ہجرت وسنت ہے، وہاں آپ علماء اور اشراف کو جمع فرما کر جو کہنا چاہیں کہہ دیجئے گا وہ لوگ آپ کی بات سمجھ بھی لیں گے اور اسے اس کا جائز مقام بھی دیں گے۔ عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے ہاں: اگر میں مدینہ بخیر وعافیت پہنچ گیا تو یہ بات میں اپنے سب سے پہلے خطبے میں کہوں گا۔

چوتھا اصول: اختلافی معاملات میں کسی کو اپنی رائے کا پابند مت بنائیں

شریعت کے کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں جن میں نہ نص قرآنی ہوتی ہے نہ واضح حدیث اور نہ اجماع امت سے کوئی چیز ثابت ہوتی ہے۔ اہل علم اپنی ذہنی

صلاحیت واستعداد کے مطابق اجتہاد کرکے مسئلہ بیان کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ بطور تقلید ہر ایک کو اسی عالم کی رائے کا پابند بنانے کی کوشش کرتے ہیں یہ روش صحیح نہیں۔ بلکہ ایسے امور میں وسعت ہے انسان جس مسئلہ کو اقرب الی الدیل سمجھے اس پر عمل پیرا ہو جائے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"إذا نزلت بالمسلم نازلة فإنّه يستفتي من اعتقد أنه يفتيه بشرع الله ورسوله من أي مذهب كان، ولا يجب على أحد من المسلمين تقليد شخص بعينه من العلماء في كل ما يقول، ولا يجب على أحد من المسلمين التزام مذهب شخص معين غير الرسول صلى الله عليه وسلم في كل ما يوجبه ويخبر به، بل كل أحد من الناس يؤخذ من قوله ويترك إلا رسول الله صلى الله عليه وسلم ولو فتح هذا الباب لوجب أن يعرض عن أمر الله ورسوله، ويبقى كل إمام في أتباعه بمنزلة النبي صلى الله عليه وسلم في أمته وهذا تبديل للدين

مجموع فتاوى 20/208-216

" اگر کسی مسلمان کو کوئی مسئلہ درپیش آجائے تو وہ اس کا حکم کسی ایسے اس عالم دین سے دریافت کرلے جس کے بارے میں اسے گمان ہو کہ یہ عالم دین اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی شریعت سے ہی فتویٰ دے گا چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ اور کسی بھی مسلمان کیلئے ہر مسئلہ میں کسی خاص عالم و مخصوص مذہب کی تقلید ضروری نہیں۔ کسی بھی مسلمان کیلئے یہ روا نہیں کہ وہ کسی خاص مذہب کو منتخب کرکے اس کی پیروی کرے سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہو اور آپ ہی نے واجب قرار دیا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کے علاوہ ہر شخص کی بات کو لیا بھی جا سکتا ہے اور رد بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر تقلیدِ رجال کا دروازہ کھول دیا گیا تو اس کا

نتیجہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین سے اعراض کی صورت میں نکلے گا اور امت کا ہر امام، مقتدا اور پیشوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام پر فائز ہو جائے گا جو کہ دین میں تبدیلی کے مترادف ہے۔"

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

**"ليس لأحد أن يلزم أحداً بقبول قول غيره ولو كان حاكماً".**

**فتاوى ابن تيمية (387/35**

'' کسی کیلئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ کسی غیر کے قول کا کسی کو پابند بنائے چاہے وہ حاکم وقت ہی کیوں نہ ہو''

پانچواں اصول: رائے کے اظہار سے کسی کو نیچا دکھانا مقصود نہ ہو بلکہ مخلصانہ نصیحت مراد ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

**"الدِّينُ النَّصِيحَةُ ثَلَاثًا قُلْنَا: لِمَنْ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: لِلَّهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ."**

**صحيح مسلم: كتاب الايمان، باب بيان أن الدين النصيحة**

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا کہ دین خیر خواہی کا نام ہے! ہم نے عرض کیا کہ کس چیز کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے ائمہ کی اور تمام مسلمانوں کی"۔

اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث ان چند احادیث میں سے ہے جس پر فقہ کا مدار ہے۔

محمد بن اسلم الطوسی فرماتے ہیں یہ حدیث دین کا ایک چوتھائی حصہ ہے۔

عامۃ المسلمین کو نصیحت سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اور جس چیز کو خود ناپسند سمجھتا ہے اپنے بھائی کیلئے بھی اسے ناپسند سمجھے، ان سے شفقت کا برتاؤ کرے، چھوٹے پر شفقت اور بڑے کا احترام کرے۔ ان کی خوشی پر خوش ہو اور ان کے غم پر غمگین ہو، اگرچہ اس سے اسے دنیاوی معاملات میں کوئی گزند بھی پہنچے تو اپنے بھائی کی بھلائی کی خاطر اسے برداشت کرے ۔

ابن علیہ ابو بکر المزنی سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ابو بکر رضی اللہ عنہ کو جو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فوقیت اور فضیلیت ملی وہ نماز، روزے کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس چیز سے ملی جو ان کے دل میں جاگزیں تھی۔ پھر فرمایا: ان کے دل میں اللہ کی محبت تھی اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کیلئے نصحیت اور اچھی رہنمائی کا جذبہ تھا۔''

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مومن پردہ پوشی کرتا ہے اور خیر خواہی اور نصیحت کرتا ہے۔ جبکہ فاجر پردہ دری ،مذمت اور بے حرمتی کرتا ہے۔[23]

چھٹا اصول: رائے کسی طرح بھی بری تشہیر، لعن وطعن، بہتان اور گمراہی پر مبنی نہ ہو

اسلام کسی طرح بھی اظہار رائے میں کسی کی بری تشہیر، طعن، کسی کو گالی گلوچ، کسی پر بہتان درازی اور کسی کو گمراہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا، کہ آزادیٔ رائے کو بنیاد بنا کر اس طرح کے کام انجام دئے جائیں۔

جبکہ ہمارے معاشرے میں جس رائے میں مذکورہ بالا معاملات نہ پائے جائیں اسے موئثر ہی نہیں سمجھا جاتا۔ نام نہاد مناظرات سے لیکر ٹی وی کی اسکرین پر نمایاں ٹاک شو کے سیٹ (Set) پر براجماں اصحاب تک میں غالب

اکثریت اس شرعی اصول کو پامال کر جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيءِ"

جامع الترمذی: کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی اللعنۃ

" مومن نہ تو طعن کرنے والا ہوتا ہے نہ لعن کرنے والا نہ فحش گوئی کرنے والا ہوتا ہے۔ نہ زبان درازی کرنے والا"۔

کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اظہار رائے کے نام پر فساد فی الارض کا مرتکب ٹھہرے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿٥٣﴾

الاسراء-53

اور (اے پیغمبر،) میرے (فرماں بردار) بندوں سے کہہ دو کہ (مخالفین سے کوئی بات بھی کہیں تو) ایسی کہیں کہ وہ (اخلاق کے اعتبار سے) بہترین ہو۔ کیونکہ شیطان (سخت بات کہلوا کر) لوگوں میں فساد ڈلواتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

بلکہ اسلام نے بیشتر مقامات پر زبان کو کنٹرول رکھنے کا حکم دیا ہے فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"هَلْ يُكَبُّ النَّاسَ عَلَى مَنَاخِرِهِمْ فِي النَّارِ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ"

جامع الترمذی: کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی اللعنۃ

" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو اپنی زبان پکڑ کر فرمایا اس کو روک کر رکھو (معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا

رسول اللہ !(صلی اللہ علیہ وسلم)ہم جو کچھ بولتے ہیں کیا اس پر بھی ہمارا موٴاخذہ کیا جائے گا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (پیار سے ڈانٹتے ہوئے) فرمایا معاذ! تمہاری ماں تمہیں روئے، لوگوں کو ان کے چہروں کے بل جہنم میں ان کی دوسروں کے متعلق کہی ہوئی باتوں کے علاوہ بھی کوئی چیز اوندھا گرائے گی؟"

خلاصہ کلام:

اسلام کا آزائ اظہار رائے کا فلسفہ مغرب اور نظریہ استبداد (فرعونی فکر) سے بالکل مختلف ہے۔ اور عین عدل کے مطابق ہے۔ اسلام نے اظہار رائے کی آزادی دی ہے اور اس میں عین عدل کے تقاضے کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور اس کے ایسے ضوابط متعین فرمائے ہیں جن سے انسان کا ایمان بھی محفوظ رہتا ہے، معاشرہ بھی پر امن رہتا ہے، اور انسان شخصی نقصانات، باہمی کینہ، بغض وعداوت سے بھی محفوظ رہتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہ حق کا متبع بنائے۔

إنہ ولی التوفیق

وصلی اللہ تعالی علی نبینا محمد۔

## (9) اجازت لینے سے متعلق شرعی آداب اور حکمتیں!

الشیخ جمشید سلطان عوان حفظہ اللہ

ہمارے معاشرے میں جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی کا توازن بگڑ چکا ہے وہاں گھروں سے متعلق بھی بہت سی فرسودہ وپیچیدہ رسومات ہیں جن کی وجہ سے ہم مسلمانوں کو بہت سی شرعی مخالفتوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ جس کے نتیجے میں بدگمانی، بے یقینی، جھوٹ، فریب، بدتہذیبی پروان چڑھ رہی ہے۔ اگر کوئی ملاقات کیلئے آتا ہے تو وہ آنے سے پہلے اپنی آمد سے آگاہ نہیں کرتا، اور اگر دروازے پر پہنچ جائے تو ثقافت کچھ ایسی ہو چلی ہے کہ دھڑلے سے گھر میں داخل ہو جاتے ہیں، نہ کلام نہ سلام! کچھ معلوم نہیں گھر میں خواتین کس حالت وہیئت میں اس لمحے موجود ہوں۔ اسلام دین فطرت ہے اس لئے وہ انسان کی نجی زندگی کو مکمل تحفظ دیتا ہے وہ انسان کے فطری تقاضوں سے واقف ہے اس لئے اس نے ایسے ضابطے اور اعلیٰ معاشرتی اقدار وضع کر دی ہیں کہ اگر ہم انہیں اپنی زندگی میں لاگو کر لیں تو ہمیں سکون، راحت ومسرت میسر آجائے۔ اسلام میں گھروں میں رہنے، ان میں داخل ہونے، اور ان میں انجام پانے والے تمام معاملات کی رہنمائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہمارے ہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر میں داخلے کی خبر صرف وہی دے جو اجنبی ہو، لیکن اسلامی تعلیمات یہ کہتی ہیں کہ چاہے کوئی اجنبی ہے یا گھر کا فرد وہ گھر میں بسنے والوں کی نجی زندگی کا مکمل لحاظ کرے۔ ہاں اجنبی شخص کیلئے کچھ زیادہ سخت تعلیمات ہیں اور گھر میں بسنے والوں کیلئے کچھ نہ کچھ نرمی رکھی گئی ہے لیکن آداب سب کو سکھلائے گئے ہیں جن کا مقصد محض یہ ہے کہ تلخیوں، پیچیدگیوں، اور رسوائیوں سے بچتے ہوئے ظاہری وباطنی طور پر پاکدامن معاشرہ تشکیل پائے۔ زیر نظر مضمون میں گھروں اور دیگر نجی مقامات

میں داخل ہونے سے قبل اور بعد میں جو شرعی آداب ہیں انہیں بیان کیا گیا ہے امید ہے قارئین اس سے بھرپور مستفید ہوں گے اور ان آداب کو اپنی زندگیوں میں لاگو کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان شاء اللہ (ادارہ)

تمہید

اللہ تعالی کے اشرف المخلوقات پر بے شمار انعامات واحسان ہیں جن میں سے ایک اللہ تعالی نے انسان کو گھر جیسی نعمت کا شرف بخشا جس سے اس کا قلبی وروحانی سکون واطمئنان وابستہ ہے انسان گھر میں اپنی جان ومال اور اپنی عزت وحرمات اور احساسات کو محفوظ سمجھتا ہے یہ گھر انسانوں کے لئے اسی وقت محفوظ، پر سکون وقابل اطمئنان ہو سکتے ہیں جب اس میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔ جو کوئی بھی ان میں داخل ہو اس کا گھر والوں کو علم بھی ہو اور وہ وقت بھی ایسا ہو جو ان کے لئے باعث تشویش نہ ہو اور ان کی حالت زار بھی خود گھر والوں کی نظر میں مناسب ہو نہ کہ معیوب ومکروہ۔ یہ تمام خصلتیں انسان کی فطرت میں نہ صرف شامل ہیں بلکہ اللہ تعالی نے اپنی شریعت میں اس کا مکمل باظابطہ حکم دیا ہے۔ عام طور پر انسانوں اور خاص طور پر مسلمانوں کو ان آداب کی تعلیم دے کر اس کی اہمیت وافادیت کو رہتی دنیا تک دوام وقیام بخش دیا ہے۔

اگر ہم اپنے معاشرے کا محاسبہ کریں تو ہمیں اس میں ایسی عادات وتکلفات کا ادراک ہو گا جسے ہم اپناتے تو ہیں لیکن وہ ہمارے لئے سر درد سے کم نہیں، ان ہی کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں عموما اور خاندانوں میں خصوصا پریشانیاں و ناچاکیاں جنم لیتی ہیں اسلام نے ہمیں جن عادات کی تہذیب کی ہے اس میں گھر سے متعلق آداب بھی شامل ہیں۔ جس سے عوام الناس ناواقف ہیں اور طرح طرح کی تکلفات ونظریات کی وجہ سے ہم اپنے من گھڑت ماحول

میں پھنسے ہوئے ہیں۔اسلام نے انسانوں کی ثقافت وتمدن کے لئے بے شمار احکامات وارشادات فرمائی ہیں جنہیں اپنانے سے ہمارے قلب وذہن کا بوجھ بھی ہلکا ہوجاتا ہے اور معاشرہ کئی قسم کے تکلفات سے بھی آزاد ہوجاتا ہے۔ذرا غور کریں ہم اپنے گھروں میں ہوں یا کسی بھی مقام پر اگر کوئی بغیر اجازت یا بغیر وقت لئے آجائے تو اکثر ہماری طبع پر اس کا یہ فعل نہایت گراں گذرتا ہے،ایسے میں اگر ہمیں کسی کو منع کرنا ہو تو ہم یا تو جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں یا پھر کوئی ایسا بہانہ تراشتے ہیں جس سے آنے والے کو بھی دھچکا لگتا ہے اور کہنے والا بھی عجیب کشمکش میں واقع ہوجاتا ہے۔اور ایک دوسرے کے بارے میں برے تصورات اور بدگمانیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

اس کے برعکس اگر سچ کہہ دیا جائے کہ ہم کسی عذر کی بناء پر نہیں مل سکتے تو آنے والے سے قطع تعلقی نہ گذیر ہوجاتی ہے کیونکہ آنے والے کو یہ تو احساس ہوتا ہے کہ مجھے اجازت نہ دے کر میری توہین کر دی گئی،مگر اس کو یہ احساس ہی نہیں کہ گھر والے کے ساتھ کیا مسائل و اعذار ہیں،کیونکہ آنے والے کو معلوم ہی نہیں کہ شریعت نے اسے کیا تعلیم دی ہے اور اسے ناراض ہونے کا کتنا اختیار دیا ہے۔

زیر نظر سطور میں گھریلو آداب سے متعلق اہم ہدایات قارئین کے سامنے رکھی جائیں گی اللہ تعالیٰ اسے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے "انہ ولی علی ذلک والقادر علیہ" (آمین)

گھر میں داخلے سے پہلے تو اجازت لینا اور گھر والوں کی آمد سے باخبر کرنا ضروری ہے۔

اللہ تعالی کا ارشاد کریم ہے:

}يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓي اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ.فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ

وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْکُوْنَۃٍ فِیْھَا مَتَاعٌ لَّکُمْ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَکْتُمُوْنَ{

]النور:27-29[

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ ان کی رضا حاصل نہ کرو اور گھر والوں پر سلام نہ کر لو۔ یہ بات تمہارے حق میں بہتر ہے، توقع ہے کہ تم اسے یاد رکھو (اور اس پر عمل کرو) گے۔ پھر اگر ان میں کسی کو نہ پاؤ تو جب تک تمہیں اجازت نہ دی جائے اس میں داخل نہ ہونا۔ اور اگر تمہیں کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ آؤ۔ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور جو کام تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ البتہ بے آباد گھروں میں داخل ہونے سے تم پر کوئی گناہ نہیں جہاں تمہارے فائدے کی کوئی چیز ہو۔ اور اللہ خوب جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے اہل ایمان کو گھر میں داخل ہوتے وقت عالی اخلاق و آداب اپنانے کا حکم دیا ہے جس میں اس گھر کی حرمت اور گھر والے کی عزت وعفت کا تحفظ بھی ہے اور گھر والوں کی طرف سے آنے والے کے لئے احترام واکرام کے پہلو کو بھی اجاگر کیا ہے اور اس طریقہ کے اختیار کرنے میں خیر کثیر کی نوید بھی سنائی ہے۔

شریعت میں اجازت کے حوالے سے لفظ "استئذان" استعمال کیا گیا ہے ذیل میں اس لفظ کی وضاحت پیش ہے۔

' 'استئذان" کیا ہے؟

"استئذان" لفظ "اذن" سے نکلا ہے جس کے لغت عرب میں مختلف معنی ہیں جن میں "جاننا اور معلوم کرانا"[2] "اس کو معاملہ سمجھادیایا معلوم کرادیا" کے معنی میں مستعمل ہے۔

ابن عربی کہتے ہیں استئذان کو استئناس (مانوسیت) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ معنی میں استعلام (معلوم کرنے) کی طرح ہے۔[3]

قرآن کریم میں لفظ اذن اپنے محل و موقع کے اعتبار سے معنی و مفہوم دیتا کہیں اس کا معنی "اجازت لینا" اور کہیں "حکم" کے معنی میں آتا ہے۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ استئذان کی تعریف میں لکھتے ہیں:

**"الاستئذان: طلب الإذن بالدخول, لمحل لا يملكه المستأذن"[4]**

ترجمہ "کسی ایسی جگہ داخل ہونے کے لئے اجازت طلب کرنا جہاں انسان بغیر اجازت داخل ہونے کا مجاز نہ ہو"

استئذان کی اقسام

بنیادی طور پر ہم استئذان کو دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

1 باہر سے آنے والے اجنبی فرد کا اجازت لینا

یہ وہ قسم ہے جس کو استئذان عام کہا جاتا ہے جو کہ باہر سے آنے والے اجنبی لوگوں کا ایک دوسرے سے اجازت طلب کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ یہاں اجازت لینا واجب ہے جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے:

**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ**

**سورہ النور آیت نمبر 27**

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ ان کی رضا حاصل نہ کرو اور گھر والوں پر سلام نہ کر لو۔ یہ بات تمہارے حق میں بہتر ہے توقع ہے کہ تم اسے یاد رکھو (اور اس پر عمل کرو) گے۔

اور پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"إذا استأذن أحدكم ثلاثاً، فلم يؤذن له فليرجع"[5]

ترجمہ: جب تم میں سے کوئی تین مرتبہ اجازت لے اور سے اجازت نہ ملے تو اسے چاہئے کہ لوٹ جائے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث کی رو سے اگر اذن نہ ملنے کی صورت میں لوٹ جانے کا حکم اس لئے ہے کہ (گھر میں داخلے کے لئے) اجازت لینا واجب ہے۔

2 گھر میں موجود فرد کا کسی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لینا:

یہ وہ قسم خاص ہے جو کہ گھر کے اندر لی جاتی ہے اس کا بھی حکم چند صورتوں میں واجب کا ہے۔ جس کی دلیل قرآن کریم کی آیت:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ]النور:58

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے غلاموں اور ان لڑکوں پر جو ابھی حد بلوغ کو نہ پہنچے ہوں، لازم ہے کہ وہ (دن میں) تین اوقات میں اجازت لے کر گھروں میں داخل ہوا کریں۔

آیت کریمہ میں "لِيَسْتَاْذِنْكُمْ" میں "لام" استعمال ہوا ہے جو کہ "لام الامر" ہے اور فعل امر وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

## اجازت لینے کی حکمت وعلت

اجازت طلب کرنا ایک ایسا بلند ادب ہے جو گھروں کی رازداری (پرائیویسی) کی حفاظت کرتا ہے اور ایسے معاملات کی بھی جو کہ عظمت وعفت کے لئے ہیں جنہیں اہل خانہ باپردہ رکھنا چاہتے ہیں استئذان انہی اشیاء ومعلومات کی حرمت کو برقرار رکھتا ہے ان میں انسانی جسم سرفہرست ہے اس کے علاوہ بہت سی اشیاء ایسی بھی ہیں جنہیں انسان چھپانا چاہتا ہے جن میں کھانا پینا، کپڑے وغیرہ اور گھریلو اشیاء بھی شامل ہیں جن پر اچانک نظر پڑے تو ناگواری محسوس ہوتی ہے اور یہ تمام باتیں انسانی ذہن اور نفسیات سے تعلق رکھتی ہیں جن کا اثر انسانی معاشرے اور خاندانی زندگی پر پڑ سکتا ہے، ہم میں سے کتنے ہیں جن کو یہ پسند نہیں کہ کوئی انہیں کمزوری کی حالت میں روتے ہوئے، یا غصہ کی حالت میں دیکھ لے، کتنے لوگوں کو پسند نہیں کہ کوئی انہیں نامناسب لباس میں دیکھے۔ اس طرح آداب استئذان شکوک وشبہات بدزبانیوں اور تہمت واوہام کو روکنے کا موثر ذریعہ ہے جو کہ میاں بیوی یا گھر کے دوسرے افراد کی زندگی میں تفریق وبربادی کا باعث بن جاتے ہیں۔ جو کہ بچوں کی تربیت پر اثر انداز ہو جاتے ہیں اور کبھی ان کی یتیمی کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔ ان تمام باتوں کا ایک ہی محور ہے اور وہ ہے انسان کی نظر۔

اسلام نے معاشرے پر پڑنے والے انہی دور رس نتائج کا مکمل احاطہ کیا اور اس میں رہنے والوں کی عقلی اور اخلاقی اقدار کو مضبوط ایمانی قوت مہیا کی کہ اگر استئذان کی حکمت سمجھ سے بالا ہو تو صرف اتنا مان لینا کہ یہ خالق کائنات اللہ تعالیٰ کا حکم ہے انہیں حکمت کی تلاش سے مستغنی کر دیتا ہے اور اس میں خیر ہی ہے، اسے جھٹلانا معاشرے کے لئے فساد وبربادی ہے۔

''استئذان'' کی علت کا پس منظر یوں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اللہ تعالی کے احکامات قرآن کریم کی صورت میں نازل ہو رہے تھے جو کہ قیامت تک کے لئے ہدایت ورشد کا راستہ قرار پائے، ایسے میں ایک دفعہ ایک انصار قبیلہ کی خاتون صحابیہ رضی اللہ عنہا پیارے پیغمبر مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے گھر میں موجود ہوتی ہوں اور میں اس حالت میں ہوتی ہوں کے مجھے یہ بات پسند نہیں ہوتی کہ مجھے کوئی دیکھے نا والد اور نا ہی کوئی بچہ مگر ایسے میں کبھی میرے گھر کا کوئی فرد آجاتا ہے کبھی والد آجاتے ہیں اور میں اسی حالت میں ہوتی ہوں تو میں کیا کروں؟[6] اس سے پہلے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ فرماتے کہ اللہ تعالی نے قرآنی آیت کی صورت میں اس سوال کا جواب عنایت فرمادیا اور اس امر کی اہمیت وافادیت کو عظیم قرار دیا، جبریل امین نے یہ آیات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائی جس میں سوال کا جواب اور مسئلہ کا حل دونوں موجود تھے چنانچہ فرمایا:

**يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (27) فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا ۚ هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ**

**سورہ النور آیت 27 تا 28**

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ ان کی رضا حاصل نہ کرو اور گھر والوں پر سلام نہ کرلو۔ یہ بات تمہارے حق میں بہتر ہے توقع ہے کہ تم اسے یاد رکھو (اور اس پر عمل کرو) گے۔

مندرجہ بالا آیات میں اگر ہم غور وتدبر کریں تو اس میں اجازت لینے کے لئے عام حکم دیا گیا ہے جس میں کسی قسم کی تخصیص نہیں ہے۔ اور وہ تقاضہ کرتی ہیں کسی

مقام یا گھر میں بغیر اجازت داخل نہیں ہونا چاہئے چاہے اس گھر میں کوئی موجود ہو یا نہ ہو اور بلکہ اجازت لے کر داخل ہونا چاہئے البتہ وہ مقامات جو کہ ذاتی ہوں یا عوامی مقامات ہوں جیسے ہوٹل تجارتی محلات وغیرہ ان میں داخل ہونے کے لئے اجازت طلب کرنا لازمی نہیں بلکہ مستحب عمل ہے۔

جیسا کہ ہم نے گذشتہ سطور میں ذکر کیا کہ استئذان کی دو قسمیں ہیں ان میں سے ایک گھر کے اندر سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری قسم کا تعلق گھر کے باھر سے ہے جو کہ گھر والوں سے طلب کی جاتی ہے یا عزیز واقارب کی طرف سے یا پھر زائرین کی طرف سے، چنانچہ جب بھی کوئی گھر میں داخل ہونا چاہے تو اس کو چاہئے کہ گھر میں داخل ہوتے وقت کوئی ایسا عمل اختیار کرے جس سے اندر موجود افراد کو آنے والے کی آمد کا علم ہو جائے اور وہ حسب ضرورت اس کے لئے تیار رہیں۔

اجازت لینے کے آداب

1 سب سے پہلے سلام کریں

استئذان میں شریعت نے جن آداب کو ملحوظ خاطر رکھا ان میں اعلیٰ دعائیہ کلمات "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" شامل ہیں اور یہ دو مختلف آیات ومقامات پر ذکر ہوئے۔

ایک فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا﴾

سورہ النور آت نمبر 27

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ ان کی رضا حاصل نہ کرو اور گھر والوں پر سلام نہ کر لو۔ [النور: 27]

اور دوسرا فرمان جو کہ اس بھی عام ہے چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً﴾

سورہ النور آیت نمبر 61

ترجمہ: البتہ جب تم گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے لوگوں (گھر والوں) کو سلام کہا کرو۔ یہ اللہ کی طرف سے مبارک اور پاکیزہ تحفہ ہے۔[النور:61]

' 'السلام علیکم" کہنے سے انسان کی نیکیوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس میں طرفین کے لئے دعا بھی ہے لہٰذا استئذان کے لئے تحیۃ الاسلام "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہا جائے جو کہ افضل و مسنون عمل ہے۔

پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے خادم انس بن مالک رضی اللہ عنہ جنہوں نے دس سال محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیتوں میں سے ایک وصیت یہ بھی تھی:

' 'اے بچے! جب بھی اپنے گھر میں داخل ہو تو پہلے سلام کرو اور یہ تمہارے لئے اور گھر والوں کے لئے باعث برکت ہے"۔[7]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"إذا دخل الرجل بيته، استُحِبَّ له أن يتنحنح ثم يسلِّم"

' 'اگر کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہو تو اسے چاہئے کہ وہ پہلے کھنکھنائے اور پھر سلام کہے"۔

اور مذکورہ آیت میں ﴿فَسَلِّمُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ] سے مراد اپنے گھر والوں کو سلام کہو اور اس آیت کے الفاظ میں اگر تدبر کریں تو اللہ تعالیٰ نے یہاں "﴿أَنْفُسِكُمْ" کا لفظ استعمال کیا جس میں اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کوئی کسی کے گھر میں داخل ہوگا تو اجازت لینے کے لئے سلام کہے گا تو جواباً

اسے بھی سلامتی کی دعا نصیب ہو گی اور ساتھ ساتھ وہ کئی قسم کی مکروہات سے بھی محفوظ ہو جائے گا مثلاً جواب یا اجازت نہ ملنے کی صورت میں وہ کسی ایسی چیز پر نظر ڈالنے سے باز رہے گا جو کہ گھر والوں کے لئے باعث تکلیف ہو یا ان کے ستر و عیوب سے آگاہی یا ایسا معاملہ جو کہ دونوں کے لئے اذیت اور تفرق کا باعث بنتا ہو۔ تو جس طرح شرعی طریقہ کو اختیار کرتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو کئی مکروہات سے سلامت رکھا اور اسی طرح اس نے دوسرے کے گھر کی عفت و عصمت کا بھی احترام قائم رکھا۔

2 عزیز و اقارب سے بھی اجازت طلب کی جائے

شریعت اسلام نے معاشرے کو جو آداب سکھلائے وہ تمام افراد کے لئے یکساں موزوں ہیں لھذا عزیز و اقارب میں سے اگر کوئی کسی کے گھر میں داخل ہو تو وہ بھی اجازت حاصل کریں چاہے وہ بہن کا گھر ہو، بھائی کا، پھوپھی کا گھر ہو یا خالہ کا ،اس کی کئی حکمتیں ہیں ایک تو آپس کے باہمی تعلقات نیک تمناؤں پر استوار ہوں اور میزبان آنے والے کا استقبال اچھے انداز میں اور باہمی رضامندی سے کر سکیں اور کسی قسم کی عار محسوس نہ کریں اور ایمان اور نیکی سے منور معاشرہ پروان چڑھے جو کہ دوسرے معاشروں سے ممتاز ہو جس میں اللہ تعالی نے اپنے بندوں کے لئے بھلائی، خیر اور طہارت و عفت رکھی ہے جو معاشرہ میں ایمان و سلامتی کی حرارت کو زندہ رکھتی ہے۔ قرون مفضلہ میں معلم انسانیت اور ہادی و مربی اکبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عظیم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور اپنی امت کی اسی منہج پر تربیت کی مؤطا امام مالک میں روایت ہے کہ ایک صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں اپنی والدہ سے بھی اجازت لوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا ہاں۔

جب بھی گھر میں داخل ہو تو اپنی والدہ سے اجازت لو۔ اس نے جواباً کہا: میں گھر میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتا ہوں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا تم اذن لے کر داخل ہوا کرو، اس نے جواب دیا کہ میں ہی اپنی والدہ کی ہمیشہ خدمت کرتا ہوں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: تم ضرور اجازت لیا کرو کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ تم اپنی والدہ کو مکروہ حالت میں دیکھو؟ تو اس صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً کہا نہیں! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اب ضرور اجازت لیا کروں گا۔] 8[

عطاء فرماتے ہیں میں نے ابن عباس سے پوچھا:

**"أأستأذن على أختي، فقال: نعم؛ فأعدتُ، فقلتُ: أختان في حجري، وأنا أموّنهما، وأنفق عليهما، أستأذن عليهما، قال: نعم، أتحبّ أن تراهما عريانتين]"9[**

ترجمہ: "کیا میں اپنی بہن سے بھی اجازت لے کر داخل ہوا کروں؟ تو انہوں نے کہا: ہاں ۔ میں نے دہرایا کہ: میں اپنی دو بہنوں کے ساتھ رہتا ہوں اور ان کی سرپرستی اور ان کی دیکھ بھال بھی کرتا ہوں تب بھی اجازت لوں؟ تو جواب ملا کہ: ہاں کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ تم انہیں نامناسب حالت میں دیکھ لو؟؟؟' '

معلوم ہو کہ جب بھی گھر میں یا کمرہ میں داخل ہوں تو ضرور بضرور اجازت لینی چاہئے اور اس وقت تک داخل نہ ہوں جب تک اجازت نہ مل جائے یہی دین حنیف ہے اسی میں حفظ النفوس اور حفظ عزت وعفت ہے یہی عالی اخلاق کا مظہر جس پر عائلی زندگی بھلائی تقویٰ اور محبت ومودت پر قائم رہ سکتی ہے۔

3 اجازت کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

استئذان کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جب بھی کسی جگہ جانا ہو تو سب سے پہلے آنے والے کو چاہئے

کہ وہ لطف و آرام سے دروازے کو کھٹکھٹائے جس سے گھر والوں پر کسی قسم کا ازعاج و تشویش نہ ہو۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے دروازے کو ہم اپنے ناخن سے بجاتے اور پھر تین بار اجازت لیتے تھے"۔] 10[

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

**"وهذا محمول منهم على المبالغه في الأدب وهو حسن لمن قرب محله من بابه، أما من بعد عن الباب بحيث لا يبلغه صوت القرع بالظفر فيستحب أن يقرع بما فوق ذلك بحسبه" أهـ]11[**

ترجمہ: یہ عمل ان کے عالی ادب و اخلاق کا مظہر ہے جو کہ قریب دروازہ کے لئے بہتر ہے لیکن جہاں دروازہ گھر سے دور ہو وہاں حسب ضرورت زور سے دروازہ بجایا جا سکتا ہے۔

لہٰذا دروازہ بجانے کے بعد تھوڑا انتظار کیا جائے اور اس بات کا یقین کر لیا جائے کہ گھر والوں نے اگر نہیں سنا تو دوبارہ بجانا چاہئے اور اسی طرح مزید انتظار کر کے تیسری مرتبہ بجایا جائے۔

4 اجازت یا جواب نہ ملنے پر کیا کیا جائے؟

اگر اجازت لینے اور دروازہ بجانے یا کھٹکھٹانے کے باوجود کوئی جواب نہ ملے تو گھر میں داخل نہیں ہونا چاہئے بلکہ لوٹ جانا چاہئے اور یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

**﴿فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾**

**سورہ النور آیت نمبر 28**

ترجمہ: پھر اگر ان میں کسی کو نہ پاؤ تو جب تک تمہیں اجازت نہ دے اس میں داخل نہ ہونا۔ اور اگر تمہیں کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ آؤ۔ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور جو کام تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں اس بات کی طرف نشاندہی کی گئی ہے کہ بالفرض آنے والے کو واپس جانے کا کہا جائے تو واپس لوٹ جانا چاہیئے اس میں کسی قسم کا کوئی حرج واثم نہیں ہے مثلاً اگر گھر والے اندر موجود ہوں اور خود ہی یہ کہیں کہ آپ واپس لوٹ جائیں تو بغیر کسی غم وغصہ کے واپس لوٹ جانا چاہیئے یہی نفوس کے لئے اطیب وازکیٰ ہے اور اس بات پر اپنے دل کو اطمئنان دلانا چاہیئے کہ ہر کسی کو اعذار واسرار لاحق ہوسکتے ہیں اور یہ بات جان لینی چاہیئے کہ یہ گھر والوں کا حق ہے جو اللہ تعالیٰ نے برقرار رکھا اور اس کی مذمت نہیں فرمائی اللہ تعالی کا فرمان ہے:﴿وَإِنْ قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ﴾[النور:28]

ترجمہ: اور اگر تمہیں کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ جایا کرو۔ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ["هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ"] سے مراد کہ اس (لوٹ جانے میں) تمہارے لئے بہتری ہے کہیں تنگ دلی سے اجازت ملے، بہتر ہے کہ خوشی سے تمہیں اجازت دی جائے"۔[12]

علامہ ابن عاشور رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:"اس آیت میں صراحتاً حق کی تعلیم دی گئی ہے تاکہ کسی قسم کا ابہام نہیں ہونا چاہیئے اور نہ ہی کوئی اذیت کا پہلو باقی رہے اس طرح ملنے والے کو بھی اطمینان رہے گا اگر حق تسلیم کرنے کا رواج عام ہو جائے تو تمام شکوک شبہات اور دلوں کی کدورتیں دور ہو جائیں]" 13[

پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"إذَا استأذنَ أحدُكم ثلاثًا فلم يُؤذَن له، فليَرجِع]"14[

ترجمہ: "جب تم میں سے کوئی اجازت طلب کرے اور سے اجازت نہ ملے تو تمہیں واپس لوٹ جانا چاہئے"۔

اور جب یقین سے معلوم ہو کہ گھر میں کوئی موجود ہے، مگر جواب نہیں مل رہا تو جواب نہ ملنے پر بھی واپس لوٹ جانا چاہئے۔ اس بارے میں صحیح بخاری میں حدیث ہے:

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں انصار کی ایک مجلس میں تھا۔ تو ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھبرائے ہوئے آئے اور کہا کہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے تین بار اجازت مانگی مگر اجازت نہیں ملی تو میں واپس لوٹ گیا پھر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تمہیں اندر آنے سے کس چیز نے روکا؟ میں نے کہا کہ میں نے اجازت مانگی لیکن آپ نے اجازت نہ دی اس لئے میں واپس لوٹ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص تین بار اجازت مانگے اور اس کو اجازت نہ ملے تو اس کو لوٹ جانا چاہئے۔ جناب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تم کو اس پر گواہ پیش کرنا ہوگا اور ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا تم میں سے کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس فرمان کو سنا ہے ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ بخدا تیری گواہی کے لئے قوم کا کمسن شخص کھڑا ہوگا۔ راوی کا بیان ہے کہ میں اس وقت سب سے کمسن تھا میں ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ کھڑا ہوا اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر دی کہ جی ہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے۔]15[

ایک روایت میں الفاظ ہیں یہ سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
"أَخَفِيَ هَذَا عَلَيَّ مِنْ أَمْرِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلْهَانِي الصَّفْقُ بِالأَسْوَاقِ (يَعْنِي الخُرُوجَ إِلَى تِجَارَةٍ) أَلْهَانِي الصَّفْقُ بِالْأَسْوَاقِ].16[

ترجمہ: مجھ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بازار میں خرید و فروخت کی وجہ سے پوشیدہ رہی۔

علامہ ابن عاشور رحمہ اللہ کہتے ہیں اس حدیث سے واضح ہوا کہ استئذان میں تین حالات ہو سکتے ہیں:

اذن [اجازت حاصل ہو جائے]۔

معذرت کی جائے [منع کر دیا جائے]

کوئی جواب نہ ملے (خاموشی ہو)

آیت کریمہ اور حدیث شریف کی رو سے پہلی صورت میں داخل ہونا جائز ہے اور دوسری دونوں صورتوں میں واپس لوٹ جانا چاہئے۔]17[

5 اجازت کتنی بار لینی چاہئے؟

سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتا ہے کہ استئذان تین بار مشروع ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار سعد بن عبادۃ کے گھر تشریف لے گئے اور کہا: (السلام علیکم) اندر سے جواب نہیں ملا تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: (السلام علیکم) اندر سے پھر جواب نہ ملا تیسری بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا جواب نہ ملا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس چل دئے، جب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اب سلام نہیں پایا تو آپ سمجھ گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ گئے ہیں تو سعد بن عبادہ نے ان کا پیچھا کیا اور ان کو جا کر پالیا اور سلام کا جواب دیا اور بتایا کہ ہم چاہ رہے تھے کہ آپ کے سلام کو زیادہ سے زیادہ

حاصل کرلیں جب کہ ہم سن رہے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ تشریف لے آئے۔ ایک روایت میں قیس بن سعد فرماتے ہیں کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے ہلکی آواز میں جواب دیا تو میں نے سوال کیا کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت نہیں دیں گے تو انھوں نے جواب دیا کہ خاموش ہوجاؤ تاکہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سلام کرتے رہیں۔] 18[

امام ابن شھاب فرماتے ہیں تین بار سلام کرنا اسی حدیث سے اخذ کیا گیا ہے۔

ایک اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

**"الاستئذان ثلاث، فان أذن لک وإلا فارجع]"19[**

' 'استئذان تین بار ہوتا ہے اگر تمہارے لئے اجازت دی جائے تو داخل ہوجاؤ ورنہ واپس لوٹ جاؤ' '

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

**"الاستئذان ثلاث لا أحب أن یزید أحد علیها إلا من علم أنه لم یسمع فلا أری بأساً أن یزید إذا استیقن أنه لم یسمع]"20[**

ترجمہ: تین دفع سے زیادہ اجازت طلب کرنا درست عمل نہیں اور میں اسے پسند نہیں کرتا اگر اذن طلب کرنے والے کو یہ یقین ہوجائے کہ گھر والے نے سنا ہی نہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ مزید طلب کرلے۔

6 اجازت لینے کے لئے تعارف کی اہمیت

آداب استئذان میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ آنے والے کو اپنا مناسب تعارف کرانا لازم ہے یعنی جس سے اجازت لی جارہی ہے کم از کم اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ اجازت طلب کرنے والا کون ہے؟ کچھ لوگ جواب میں کہتے ہیں [میں ہوں!] یہ طریقہ نامناسب ہے اور پیارے رسول صلی اللہ علیہ

وسلم کو بھی بہت ناگوار گذرا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کراہت کا اظہار کیا اور صحابہ کرام نے بھی محسوس کیا اور اسے ذہن نشین کر لیا پھر لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک حدیث ذکر فرمائی: سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"أتيتُ النبيَّ –صلَّى الله عليه وسلَّم– في دَيْنٍ كان على أبي، فدققت الباب فقال: ((مَن ذا؟))، فقلت: أنا، فقال: ((أنا! أنا!))، كأنَّه كَرِهَهَا"۔[21]

ترجمہ: سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور دروازہ پر دستک دی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کون ہے؟ "میں نے کہا: "میں ہوں" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (میں! میں!) جیسے انہیں ناگوار گذرا ہو۔

مشروع طریقہ یہ ہے کہ جب پوچھا جائے تو جواب میں کہنا چاہئے کہ میں فلاں ہوں اور اپنا نام بتانا چاہئے، اگر پھر بھی پہچان نہ ہو تو اپنا مناسب تعارف کرانا چاہئے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات پر کراہت اس لئے ظاہر کی کہ "میں" سے کوئی تعارف حاصل نہیں ہو سکتا جب کہ مسئلہ اذن میں تعارف ضروری ہے جو کہ نام سے ہو سکتی ہے کیونکہ نام ہی ایسی معرفت ہے جس سے سوال کی کلفت بھی دور ہو جاتی ہے اور جواب بھی حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک بار وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مشربہ (پانی پینے کی جگہ) پر تھے تو

آپ رضی اللہ عنہ نے کہا:: السَّلَامُ عَلَيْكَ يَارَسُولَ اللهِ، السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَيَدْخُلُ عُمَرُ؟ ترجمہ: "اے اللہ کے رسول آپ پر سلامتی ہو، آپ پر سلامتی ہو کیا عمر حاضر ہو سکتا ہے؟؟
اسی طرح صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا "السلام علیکم" میں ابو موسیٰ ہوں، میں اشعری ہوں۔۔۔ الحدیث ] 22[
امام شعبہ رحمہ اللہ کے پاس ایک صاحب تشریف لائے تو انہوں نے پوچھا کون ہے؟ جواب ملا کہ میں ہو؟ امام شعبہ رحمہ اللہ نے جواب دیا میرا کوئی دوست نہیں جس کا نام "میں" ہو! پھر آپ باہر تشریف لائے اور انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی "میں" سے کراہت والی حدیث سنائی۔]23[
7 اجازت لیتے وقت کہاں کھڑے ہوں؟
استئذان میں اس بات کا خیال بھی رکھا جائے کے استئذان کے وقت گھر کے دروازے کے سامنے نہ کھڑا ہوا جائے بلکہ دائیں جانب ہونا چاہئے، اگر میسر نہ ہو تو بائیں جانب کھڑے ہو کر اجازت لینی چاہئے یہ تعلیم بھی معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کو دی امام بیہقی رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں:
**]أن سعد بن معاذ رضِي الله عنه أتى النبي صلَّى الله عليه وسلَّم، فقال له: ((ياسعد، إنما الاستِئذان من النظر، فإذا استأذنت فلا تستقبل الباب][24[**
ترجمہ: سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ایک بار پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آئے اور اس حال میں اجازت طلب کی کہ وہ دروازے کے سامنے کھڑے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت دی اور فرمایا: اے

سعد! اجازت لینے کا سبب نظر ہی ہے لہٰذا جب بھی اجازت لو دروازے کے سامنے مت کھڑے ہوا کرو۔

امام سہارنپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگر کوئی اذن طلب کرنے والا دروازے پر کھڑا ہو جائے گا تو اس کی نظر کا گھر کے اندر جانے کا احتمال موجود ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے مظاہر دیکھ لے جو کہ گھر والے کے لئے تکلیف کا باعث ہوں اور یہی استئذان کی علت ہے کہ نظر نہ پڑنے پائے"۔

اور یہ عظیم تربیتِ اسلام ہے کہ نظر کی حفاظت کی جائے کیونکہ نظر ان وسائل میں سے ہے جس سے ایسے فتنے جنم لیتے ہیں جو معاشرے میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں اسی خطرہ کے پیش نظر اگر صاحب بیت کسی جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر کوئی حرج اور جرمانہ نہیں۔ سیدنا ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

"مَنِ اطَّلَعَ فِي بَيْتِ قَوْمٍ مِنْ غَيْرِ إِذْنِهِمْ حَلَّ لَهُمْ أَنْ يَفْقَئُوا عَيْنَهُ"

[25]

ترجمہ: جو شخص کسی کے گھر میں جھانک رہا ہو تو گھر والوں کے لئے حلال ہے کہ وہ اس کی آنکھ پھوڑ دیں"۔

سیدنا سھل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے میں جھانک رہا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں کنگھا تھا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کنگھی فرما رہے تھے اس شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ فرمایا: "اگر میں یہ جان لیتا کہ تم اس طرح جھانک رہے ہو تو میں یہ کنگھا تمہاری آنکھ میں مار دیتا اجازت طلب کرنے کا سبب یہی نظر ہے"۔[26]

ایک اور روایت میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"اگر کوئی شخص تمہارے گھر میں بغیر اجازت کے جھانک رہا ہو اور تم نے اس کی آنکھ پتھر سے پھوڑ دی تو تم پر کوئی حرج (گناہ) نہیں"۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّهُ قَالَ: مَنْ مَلَأَ عَيْنَيْهِ مِنْ قَاعَةِ بَيْتٍ فَقَدْ فَسَقَ"

[27]

ترجمہ: سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا"جس شخص نے اپنی آنکھ کسی گھر کی جھانک تانک سے بھر لی پس وہ فاسق ہو گیا" "

اور آیت استئذان کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے [وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ] فرما کر تنبیہ کر ادی ان لوگوں کو جو لوگ تجسس میں آکر دوسروں کے گھروں میں داخل ہوتے ہیں اور ایسے اوقات غفلت کا انتخاب کرتے ہیں جن میں انہیں کوئی ایسی منظر کشی کرنی ہو جو ان کے لئے حلال نہ ہو اور نہ ہی انہیں زیب دیتا ہو اور وہ کسی گناہ کی ٹوہ میں لگے رہتے ہوں۔

8 الفاظ استئذان

آداب استئذان سے متعلق ایک اور ادب جس کا شریعت نے لحاظ رکھا اور وہ اجازت لینے کے الفاظ ہیں

عرب میں جاہلیت کے دور میں بھی اجازت لینے کا رواج تھا مگر وہ حسب نسب اور بادشاہ ورعایہ کے نظریات کی بھینٹ چڑھ گیا چنانچہ جب اسلام نے اپنا نور پھیلانا شروع کیا تو استئذان کے جامع اور مانع آداب امت کو سکھلا دئے۔

استئذان کے طریقے کے لئے قرآن نے جو الفاظ استعمال کئے وہ ہیں:

[حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ] [النور:27]

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ ان کی رضا حاصل نہ کرو اور گھر والوں پر سلام نہ کر لو۔ یہ بات تمہارے حق میں بہتر ہے توقع ہے کہ تم اسے یاد رکھو (اور اس پر عمل کرو) گے۔

مفسرین کا اس بات پر اختلاف رہا ہے کہ پہلے سلام کیا جائے یا پھر اجازت طلب کی جائے؟ بعض علماء نے پہلے اجازت طلب کرنا اور پھر سلام کرنا مناسب سمجھا اس کا سبب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

[حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا] اور اکثر نے عکس مناسب قرار دیا اور پہلے سلام اور پھر اجازت لینا راجح قرار دیا اور ایک قاعدہ تقدیم و تاخیر کو بنیاد بنایا اور اس کی تقدیر ٹھہرائی:

[حَتّٰى تُسَلِّمُوْا عَلٰى أَهْلِهَا وَتَسْتَأْذِنُوْا]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں یہی ترتیب ہے۔[28]

سیدنا کَلَدَۃ بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا نہ میں نے سلام کیا اور نہ اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے واپس جانے کا حکم دیا اور کہا کہ سلام کرو اور پھر کہو کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟“۔[29]

اور سیدنا عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت آتی ہے کہ ایک شخص نے آپ سے اجازت طلب کی کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو منع فرما دیا تو بعض لوگوں نے اسے سمجھایا کہ پہلے سلام کرو، اس نے سلام کیا، تو انہیں اجازت دی گئی۔

امام ابن سیرین رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اجازت طلب کی، کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم یا خادمہ جس نام کا روضہ تھا کو حکم دیا کہ جاؤ اسے استئذان کا طریقہ سکھاؤ وہ نہیں جانتا کہ استئذان کا طریقہ کیا ہے۔ اس کو کہو کہ سلام کرے پھر کہے کیا میں داخل ہو سکتا ہوں اس شخص نے سن لیا اور ایسے ہی کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آنے کی اجازت دی۔

سیدنا عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو سلام سے پہل نہ کرے اسے اجازت نہ دو"۔

صیغہ استئذان کے متعلق روایت ہے: زید بن اسلم نے ایک بار عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے استئذان کیا اور "أألج" (زمانہ جاہلیت میں عرب کا استئذان تھا ): ابن عمر نے انہیں اجازت دیتے ہوئے کہا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے تم عرب کا استئذان استعمال کرتے ہو! جب بھی استئذان کرو تو "السلام علیکم" کہا کرو جب تمہیں جواب مل جائے تو پوچھو کہ کیا میں اندر آسکتا ہوں؟]" 30[

امام بغوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا کہ بعض علماء نے اختیار کیا کہ اگر انسان کی نظر پہلے پڑ جائے تو سلام پہلے کرے ورنہ استئذان پہلے کرے اور پھر سلام کرے۔]31[

گھر کے اندر اجازت لینے سے متعلق چند اہم گذارشات:

اس کے بعد سورۃ النور میں استئذان خاص کے تعلق سے اللہ تعالی نے تین اوقات میں بغیر اجازت کے داخل ہونے سے منع فرمایا ہے اور وہ اس آیت کریمہ میں ذکر ہیں: س

أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ۚ مِّن قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ۚ ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ ۚ طَوَّافُونَ عَلَيْكُم بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٨﴾ وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٩﴾

**سور النور آیت نمبر 58-59**

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے غلاموں اور ان لڑکوں پر جو ابھی حد بلوغ کو نہ پہنچے ہوں، لازم ہے کہ وہ (دن میں) تین بار اجازت لے کر گھروں میں داخل ہوا کریں۔ نماز فجر سے پہلے اور ظہر کے وقت جب تم کپڑے اتارتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد یہ تین اوقات تمہارے لئے پردہ کے وقت ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ (دوسرے وقتوں) میں ان کو بلا اجازت آنے جانے سے نہ ان پر کچھ گناہ ہے اور نہ تم پر، تمہیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے ارشادات کی وضاحت کرتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

مندرجہ بالا آیات استئذان خاص کے احکام سے متعلق نازل ہوئیں اس میں تین اوقات کا ذکر ہے جن میں بغیر اجازت کے داخل ہونا منع قرار دیا ہے:

فجر کی نماز سے پہلے جب انسان اپنے بستر سے اٹھتا ہے اور اپنے رات کے لباس کو تبدیل کر کے دن کا لباس پہننا چاہتا ہے۔

ظہر کا وقت جب لوگ قیلولہ کرتے ہیں۔

نماز عشاء کے بعد جب لوگ اپنے لباس کو اتارنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور سونے کی تیاری رکھتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت میں جن تینوں اوقات کا ذکر ہے یہ اوقات آرام کے ہیں لھذا عوام الناس کو گھروں کے اندر داخل ہونے سے روک دیا گیا ہے تا کہ ناپسندیدہ منظر کو نہ دیکھ لیں[32] ان اوقات کو اللہ تعالی نے "عورات" (ستر) کا نام دیا ہے جو کہ عام ہے اس میں بدن کا پردہ بھی شامل ہے اور گھر کی اشیاء کا بھی پردہ شامل ہے، اس میں خدام خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اور وہ بچے جو جوان نہ ہوئے ہوں مگر عورتوں کی پوشیدہ معلومات سے واقف ہوں اور سن بلوغت کو نہ پہنچے ہوں شامل ہیں البتہ غیر مذکورہ اوقات میں ان کا آنا جانا مجبوری اور ہر وقت اجازت مانگنا بھی مشکل امر اور بضرورت آتے جاتے ہیں اس لئے اس میں کوئی حرج نہیں ہے

۔

یہاں واضح رہے کہ آیت میں جن خادموں کا بیان ہوا ہے وہ غلام ہیں جو مستقل ایک گھر کے افراد کی حیثیت سے مالک کے ساتھ ہوتے ہیں آج کل کے دور میں جو گھر میں ملازم رکھے جاتے ہیں وہ چاہے کسی حیثیت سے ہی کیوں نہ ہوں، ڈرائیور، باورچی ، چوکیدار ان سب کو پردے کا لحاظ کرنا چاہئے اور کسی وقت بھی نامحرم عورت یا گھر کی مالکن سے ملنا اور بے تکلفی اختیار کرنے کی اجازت نہیں اور نہ ہی اس کمرے میں داخلے کی جہاں مستورات رہتی ہوں یہ تین اوقات اس قسم کے ملازموں کے لئے نہیں ہیں۔

خلاصہ

اسلام میں اجازت کے آداب بہت واسع اور جامع ہیں صرف گھر میں داخل ہونے کے لئے نہیں بلکہ یہ تمام آداب مجالس اور دیگر مقامات کے لئے بھی موزوں و مفید ہیں چنانچہ ان آداب کے ساتھ ساتھ داخل ہوتے وقت مندرجہ ذیل اہم امور جو کہ کتاب وسنت سے ثابت ہیں ان کا خیال رکھنا چاہئے:

(1)اجازت لینا ایک عمدہ اخلاق اور عالی ظرف میں سے ہے اس کا اہتمام قرآن وسنت سے ثابت شدہ ہے۔

(2)اجازت لینا مرد وخواتین کے لئے یکساں ہے اس میں عزیز واقارب بھی شامل ہیں۔

(3)اجازت لینے کے لئے سلام کہنا اور پھر اجازت لینا مشروع ہے۔

(3)اجازت تین دفع سے زیادہ نہیں لینی چاہئے، اور نہ ملنے پر لوٹ جانا چاہئے۔

(5)اجازت لیتے وقت اپنا نام بتانا چاہئے اور دروازے کے سامنے کھڑا نہیں ہونا چاہئے۔

(6)اجازت لینے کے لئے گھر کے مالک اور قائم مقام کی اجازت معتبر ہے۔

(4)انسان داخل ہوتے وقت اپنی نگاہ نیچے رکھے کیونکہ استئذان کی علت نظر ہی ہے۔

(5)داخل ہوتے وقت تحیۃ الاسلام ہی اپنائے دیگر الفاظ جیسے صبح بخیر، ھیلو وغیرہ سے مکمل پرہیز کریں کیونکہ اللہ تعالی نے "تسلموا" کے الفاظ استعمال کئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی "السلام علیکم" ہی سکھلایا ہے۔

(6)جہاں گھر والے بیٹھنے کا کہیں وہیں بیٹھنا چاہئے اس سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے اور اگر مجلس میں آئیں تو جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جائیں صحابہ کرام فرماتے ہیں جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو وہیں بیٹھ جاتے جہاں جگہ میسر ہوتی۔

(7) کسی کو اٹھا کر نہیں بیٹھنا چاہئے حدیث میں فرمان ہے "کوئی آدمی کسی کو اٹھا کر خود نہ بیٹھے" ‘

(8)دو آدمیوں کے درمیان بغیر اجازت نہ بیٹھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "کسی آدمی کو جائز نہیں کہ وہ بلا اجازت دو آدمیوں کے درمیان بیٹھ کر ان میں جدائی ڈال دے[33]۔

(9)اپنے لئے لوگوں کا احتراماً کھڑا ہونے کے عمل سے احتراز کرنا چاہئے: پیارے پیغمبر کا فرمان ہے: جو "شخص اس بات سے خوش ہو کہ لوگ اس کے سامنے کھڑے ہوں تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے]' ' 34[

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ہمیں شرعی آداب اپنانے کی توفیق عطا فرمائے

فإن أصبت فمن الله وإن أخطأت فمني ومن الشيطان وما توفيقي إلا بالله

وصلی اللہ تعالی علی نبینا محمد والہ وصحبہ أجمعین

[1]فاضل مدینہ یونیورسٹی

[2]المعجم الوسیط ج ا ص 11

[3]احكام القرآن لابن العربي، ج3، ص.1396

[4]فتح الباري لابن حجر 5/ 3

[5]بخاري: كتاب الإستئذان, باب الإستئذان والتسليم ثلاثا

[6]اسباب النزول للواحدی ج3 ص213

[7]جامع الترمذي: كتاب الإستئذان والآداب, باب ماجاء في التسليم

[8]موطا امام مالک، باب استئذان

[9]امام البانی نے اسے صحیح کہا ہے دیکھئے سلسلہ الصحیحۃ رقم:3636

[10]شعب الإيمان للبيهقي، فصل في قرع الباب عند الإستئذان

[11]فتح الباري لابن حجر:11/ 36

[12]تفسير القرطبي:12/ 220

[13]التحرير والتنوير:18/196

[14] صحيح البخاري: كتاب الاستئذان، باب التعليم والاستئذان ثلاثاً

[15] صحيح البخاري: كتاب الاستئذان باب التسليم والاستئذان ثلاثاً

[16] صحيح البخاري: كتاب الاستئذان باب التسليم والاستئذان ثلاثاً

[17]التحرير والتنوير:18/196

[18]سنن أَبي دَاوُدَ:4/344

[19] صحيح مسلم:3/1694

[20]تفسير القرطبي:12/214

[21] صحيح البخاري: كتاب الاستئذان، باب اذا قال من ذا فقال أنا

[22] صحيح مسلم:3/1696

[23]الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع للخطيب البغدادي:1/163

[24]السنن الكبرى للبيهقي: كتاب الاستئذان من النظر

[25] صحيح مسلم: كتاب الآداب، باب تحريم النظر في بيت غيره

[26] صحيح البخاري: كتاب الاستئذان، باب من اطلع في بيت قوم

[27]تفسير القرطبي:12/220

[28]تفسير البغوي-إحياء التراث 3/398

[29]سنن أبي داود: كتاب الاستئذان، كيف الاستئذان

[30]سنن أبي داود: كتاب الاستئذان، كيف الاستئذان

[31]تفسير البغوي- طبع إحياء التراث 3/398

[32]احكام القرآن لابن العربي:31397

[33]سنن أبي داود: كتاب الآداب، باب في الرجل يجلس بين الرجلين

[34] سنن أبي داود: کتاب الآداب، باب فی قیام الرجل للرجل

## (10) انکارِ حدیث کا مطلب اور منکر حدیث کا مصداق کون؟

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ

سوال: انکار حدیث کا مطلب اور منکر حدیث کا مصداق کون ہے؟

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وبعد

الجواب بعون الوھاب والیہ المرجع والمآب

یہ سوال اور اس کا جواب، اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ مستشرقین کے ڈسے ہوئے یا شاید مغرب کی عشوہ طرازیوں سے مسحور، یا اپنے خود ساختہ نظریات کے فتراک کے نخچیر، جس حدیث کو چاہتے ہیں قبول کر لیتے اور جس کو چاہتے ہیں رد کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ احادیث جن کی صحت پر امت مسلمہ متفق ہے اور انہیں امت کا تلقی بالقبول حاصل ہے (جیسے صحیحین کی احادیث اور دیگر صحیح احادیث ہیں) تو وہ اگر ان کے مزعومات اور باطل نظریات کے خلاف ہوتی ہیں تو وہ مردود اور ضعیف و منکر، حتیٰ کہ موضوع روایت سے بھی اگر ان کا مطلب پورا ہوتا ہو تو وہ مقبول قرار پاتی ہیں۔

اس طرح وہ بہت سی صحیح حدیثوں کو خلاف قرآن یا عقل کے خلاف باور کراتے ہیں اور ان کو رد کر دیتے ہیں۔ جب کہ مسلم امہ کے علماء اور ائمہ احدیث، ہر اس حدیث کو صحیح اور قابل حجت سمجھتے ہیں جو محدثین کے بنائے ہوئے نقد و تحقیقِ حدیث کے اصول اور ضوابط جرح و تعدیل کی روشنی میں صحیح قرار پاتی ہے یا قرار پائی ہے اور جو اس کے برعکس ہیں وہ ضعیف، منکر یا موضوع ہیں اور وہ ناقابلِ حجت ہیں۔ علاوہ ازیں علمائے امّت اور ائمہ حدیث کے نزدیک کوئی بھی صحیح حدیث نہ قرآن کے خلاف ہے اور نہ عقل کے خلاف۔ صحیح حدیث کو

خلافِ قرآن یا خلافِ عقل قرار دینا، ہر باطل گروہ کا شیوہ رہا ہے اور ہے، کیونکہ اس کے بغیر ان کے باطل نظریات کا اثبات ممکن نہیں۔

جیسے حدِ رجم کی روایات ہیں۔ یہ متواتر بھی ہیں کہ تین درجن صحابہ سے مروی ہیں۔ اور ان کی صحت پر پوری امّت کا اجماع و اتفاق بھی ہے۔ لیکن ایک گروہ اپنے خود ساختہ نظریہ رجم کے اثبات کے لئے ان روایات کو خلافِ قرآن باور کرا کے ردّ کر رہا ہے۔[2]

اس طرح حدیث، ان باطل نظریات کے حامل گروہوں کے ہاں تختہ مشقِ ستم بنی ہوئی ہے اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو حدیث کا حمایتی اور حدیث کا ماننے والا باور کراتے ہیں۔ لیکن حدیث کو ردّ کرنے کے لئے حدیث کی ایسی تعریف کرتے ہیں جس سے حدیث از خود مردود قرار پا جاتی ہے۔ جیسے اس گروہ کے بزرگ نے کہا کہ: حدیث اور سنت دو الگ الگ چیزیں ہیں، سنت تو امّت کا وہ تواتر عملی ہے جس کی رو سے نماز وغیرہ عبادات کے طریقے مسلّمہ چلے آ رہے ہیں اور یہ قرآن کی طرح حجت ہیں اور حدیث کا مطلب ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریرات۔ لیکن احادیث چونکہ ظنی (یعنی مشکوک) ہیں اس لئے یہ غیر محفوظ اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔[3]

یوں سنت و حدیث کی الگ الگ تعریف کر کے سارے ذخیرہ حدیث کو رد کر دیا۔ اس لئے ان صاحب نے صحیحین کی بیسیوں روایات کو مردود قرار دے دیا ہے۔ ان صاحب کے شاگرد نے نہلے پر دھیلا مارتے ہوئے اس میں اور اضافہ کیا اور فرمایا کہ "سنت دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا"۔[4]

اور ان سنتوں کی تعداد بھی انہوں نے متعین فرمادی ہے کہ وہ صرف 27 ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی فرمادیا ہے کہ "سنت یہی ہے۔ ان کے علاوہ یعنی قرآن اور ۲۷ سنتوں کے علاوہ) کوئی چیز دین ہے نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے" (حوالہ مذکورہ(

کیسا ادعائی انداز ہے اور کتنا بڑا دعویٰ ہے کہ دین صرف یہ 27 سنتیں ہیں۔

اس شوخ چشمانہ جارت کا حوصلہ ان صاحب کے اندر کس نے پیدا کیا؟

صرف سنت کی اپنی گھڑی ہوئی تعریف نے۔ اس طرح ان کے پیش رو اور "امام استاذ" مولانا امین احسن اصلاحی نے حدیث اور سنت کو الگ الگ کر کے سارے ذخیرہ احادیث کو غیر محفوظ اور ایک دفتر بے معنی قرار دے دیا۔ اور اس کی وجہ بھی ان کا علمی پندار اور زعم ہمہ دانی، نیز حدیث وسنت کے درمیان تفریق کرنا ہے۔ جب کہ محدثین کے نزدیک یہ دونوں لفظ مترادف المعنی ہیں اور دونوں سے مراد اقوال وافعال اور تقریرات رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔

بہر حال یہ فراہی گروہ اور اس طرح کے دیگر گروہ، جو قرآن کو حدیث کی روشنی میں سمجھنے کے قائل نہیں، بلکہ لغت یا اپنے خود ساختہ نظریات کی روشنی میں قرآن کی من مانی تفسیر کرنے کے قائل ہیں۔ یہ سارے گروہ حدیث کے بارے میں ذہنی تحفظات رکھتے ہیں، اس لئے بالکلیہ حدیث کو ردّ نہیں کرتے بلکہ اپنے مزعومات کے مطابق حدیث کو مانتے یا اس کو ردّ کرتے ہیں۔ ردّ وقبولِ حدیث کے ان مسلمہ اصولوں کو نہیں مانتے جو محدثین نے وضع کئے اور پوری امت انہی کی روشنی میں حدیث کو قبول یا ردّ کرتی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کوئی بھی گروہ کلی طور پر حدیث کا منکر نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انکار حدیث کا فتنہ سرے سے موجود

ہی نہیں ہے اور فتنہ انکارِ حدیث کا جو شور و غوغا ہے وہ یوں ہی ہے۔ حقیقت میں کوئی بھی منکرِ حدیث نہیں ہے۔

انکارِ حدیث کا مطلب اور اس کا مصداق:

لیکن کیا واقعتاً ایسا ہی ہے۔ نہیں ہر گز نہیں۔ انکارِ حدیث کا فتنہ اپنی پوری حشر سامانی کے ساتھ نہ صرف موجود ہے بلکہ روز افزوں اور وسعت پذیر ہے۔ اس لئے ہمیں غور کرنا ہو گا کہ انکارِ حدیث کا مطلب کیا ہے؟ اور اسکا مصداق کون یا کون کون ہیں؟ گمراہ فرقوں اور ان کی گمراہیوں کا علیٰ وجہ البصیرت جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلّمہ اصلاحات کو ان کے مسلّمہ مفہوم کے مطابق ماننے کے بجائے ، ان کے مفہوم میں تبدیلی کرنا اور اپنے ذہنی تحفظات یا خود ساختہ نظریات اور باطل مزعومات کی روشنی میں ان کا نیا مفہوم گھڑنا، یہ ان کی گمراہی کی اصل بنیاد ہے اور اس فن کارانہ چابکدستی سے وہ بہت سے لوگوں کو یا کم از کم اپنے حلقہ ارادت کو یہ باور کروا دیتے ہیں کہ وہ ان چیزوں (مسلمات) کے منکر نہیں ہیں جو ان اصطلاحات کا متبادر مفہوم ہے، یا اگر وہ ان کے منکر ہیں تو اس کی وجہ وہ احادیث ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں۔ جیسے پرویزی گروہ ہے جس نے صلاۃ وزکوٰۃ کے مسلّمہ مفہوم کو بدل کر ان کا ایک نیا مفہوم گھڑا جس کی بنیاد حدیث کے بجائے سنت پر ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں، غلام احمد پرویز لکھتا ہے:

" 'الصلوٰۃ، صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہے، وہ صراط جس کے بارے میں فرمایا کہ انّ ربّی علیٰ صراطٍ مّستقیم. "تیرے نشو نما دینے والے کا قانون ربوبیت، خود متوازن راہ پر چل رہا ہے "اس کے پیچھے پیچھے تم بھی چلتے جاؤ۔ مُصلّی، اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو گھوڑا دوڑ میں پہلے گھوڑے کے بالکل پیچھے پیچھے ہو، جو اِدھر اُدھر کی راہوں میں نکل جائے وہ مُصلّی نہیں' "

]5[

یہ اقتباس لغت کے بل پر تفسیر کرنے کا شاہکار ہے۔ پہلے اِنّ ربّی علیٰ صراطٍ مُّستقیم کا سیدھا ترجمہ: (میرا رب سیدھے راستے پر ہے) چھوڑ کر "لغوی ترجمہ" ملاحظہ ہو: "تیرے نشو نما دینے والے کا قانون ربوبیت، خود متوازن راہ پر چل رہا ہے' '

یہ ترجمہ لغوی ہے یا نہیں؟ تاہم فکر پرویزی یا حیلہ پرویزی کا پورے طور پر غماز ہے کیونکہ اسی پرویزی مفہوم پر "الصلوٰۃ" کا لغوی مفہوم متفرع ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہے: "اس کے پیچھے پیچھے تم بھی چلتے جائو"، اس کے بعد حاصل مراد ملاحظہ ہو: "مُصلّی، اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو گھوڑا دوڑ میں پہلے گھوڑے کے بالکل پیچھے پیچھے ہو"، لیکن مُصلّی کے معنی (نماز پڑھنے والا) نہیں بلکہ پیچھے پیچھے چلنے والے گھوڑے کے ہیں۔ اور جس "قانون ربوبیت" کے پیچھے پیچھے چلنا ہے، وہ کیا ہے؟ کمیونسٹ نظام، یا سوشلزم ہوگا اور مُصلّی (نماز پڑھنے والے) سے مراد ہے جو اس نظام کے پیچھے پیچھے چلے گا۔

یہ قرآن کی لغوی تفسیر کا کیا شاہکار نمونہ ہے۔

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

زکوٰۃ کے بارے میں بھی پرویزیوں کی لغوی تفسیر ملاحظہ ہو:

" ایتائے زکوٰۃ" اسلامی حکومت کا بنیادی فریضہ ہے۔ یعنی تمام افراد معاشرہ کو سامان نشوونما بہم پہنچانا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس کی تمام آمدنی "زکوٰۃ یعنی ذریعہ "نشوونما کہلا سکتی ہے]' ' 6[

یعنی ایتائے زکوٰۃ ہر صاحبِ نصاب کی ذمّہ داری نہیں ہے، بلکہ یہ حکومت کی ذمّہ داری ہے۔ گویا نماز کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی سے بھی فراغت۔ مزید ملاحظہ فرمایئے:

’ ’ہمارے ہاں ”ایتائے زکوٰۃ“ کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ زکوٰۃ دیں گے (یعنی لوگ زکوٰۃ دیں گے) اور زکوٰۃ سے مراد لیا جاتا ہے کہ جمع شدہ مال و دولت سے سال کے بعد اڑھائی فیصد روپیہ نکال کر غریبوں کو دے دینا۔۔۔“ ایتائے زکوٰۃ کا یہ مفہوم قرآنی نہیں]“ 7[

اس طرح غلام احمد پرویز نے احادیث اور مسلّماتِ اسلامیہ کو نظر انداز کر کے لغت کے نام پر قرآنی حقائق کو جن کا صحیح تعین احادیث سے ہوتا ہے، بری طرح مسخ کر کے اسلام کا ایک نیا ایڈیشن تیار کیا ہے۔ اور یہ صرف پرویز ہی نہیں اور بھی بعض ”اہلِ علم“ نے اسی منہج پر چلتے ہوئے قرآنی حقائق اور مسلّمات اسلامیہ سے انحراف کیا ہے۔ ایک ایسے ہی پرویز و غامدی کے ہم نوا پروفیسر خورشید عالم صاحب ہیں۔ ان صاحب نے ”لغات قرآن اور عورت کی شخصیت“ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں عورت کے بارے میں ان تمام اسلامی تصورات کی نفی کی گئی ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہیں اور چودہ سو سال سے امّتِ مسلمہ میں مسلّم چلے آرہے ہیں مثلاً

عورت کو پردے میں رکھنا، اس کو زندہ در گور کر دینا ہے۔

مرد اور عورت میں کامل مساوات ہے۔ ہر وہ کام جو مرد کرتا ہے عورت بھی کر سکتی ہے

اس لئے عورت کا مردوں کے ساتھ ہر شعبہ زندگی میں شانہ بشانہ کام کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ ملکی ترقی کے لئے ناگزیر ہے۔

مرد و عورت کی گواہی برابر ہے اور ہر معاملے میں اس کی گواہی مقبول ہے۔

ملکہ سبا ایک مثالی عورت تھی اور اس کی طرح عورت حکومت کی سربراہ بن سکتی ہے۔

حور عین، یہ اہلِ جنت کی بیویاں نہیں بلکہ ان کی ساتھی اور ہم نشیں ہوں گی اور بہن بھائیوں کی طرح آمنے سامنے بیٹھی ہوں گی۔ اور یہ جس طرح مردوں کے لئے ہوں گی، عورتوں کے لئے بھی ہوں گی۔

مخلوط تعلیم جائز ہے۔

حضرت سارہ، حضرت مریم، حضرت آسیہ کی بابت ان کا رجحان ان کی نبوت کی طرف ہے۔

مرد و عورت کا دائرہ کار الگ الگ نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک فاضل مصنفہ پروفیسر ثریا بتول علوی (بنت مولانا عبدالرّحمٰن کیلانی رحمہ اللہ) فرماتی ہیں:

''اس طرح یہ کتاب عربی لغت اور گرامر کے پردے میں عورت کے بارے میں پورا مغربی ایجنڈا مسلمانوں میں قرآن کے نام پر رائج کرنے میں کوشاں نظر آتی ہے۔ اگر اپوائی بیگمات یا این جی اوز، اسلام کے خاندانی اور تمدنی و معاشرتی مسائل کے بارے میں بات کریں تو سب کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ غلط مسائل مسلم معاشرے میں پھیلائے جا رہے ہیں۔ مگر گھمبیر مسئلہ اس وقت بنتا ہے جب نام نہاد علماء و فاضلین حضرات اپنے علم و فضل کے زعم میں، عربی لغت کے زور پر اپنی چرب زبانی کی بنیاد پر وہی کام کرتے نظر آتے ہیں جو اہلِ مغرب کو مطلوب ہے تو پھر تلبیسِ ابلیس ہمارے لئے بہت خطرناک بن جاتی ہے۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ یہ روشن خیال حضرات جو حسبنا کتاب اللہ کا دعویٰ رکھتے ہیں، خود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن پاک کی تشریح و تفسیر کا حق دینے کو تیار نہیں۔ ان کو اپنی عربی دانی پر اتنا بھروسہ ہے کہ اسی کی

بنیاد پر فرنگیت کو اسلام میں داخل کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ مغربی فکر کو زبردست لفاظی کے ذریعے قرآن وحدیث میں سے کشید کرنے لگ جاتے ہیں۔ وہ تاویل اور اجتہاد کا کلہاڑا ہاتھ میں لے کر عربی گرامر، لغت اور عربی شاعری کی مدد سے عورت کا دائرہ کار وہی متعین کرتے نظر آتے ہیں جو یو این او کے ایجنڈے، سیڈا (CEDAW) کو مطلوب ہے۔ غرض مصنف نے پرویزی فکر کو آگے بڑھایا اور غامدی فکر کو خوب پروان چڑھایا ہے۔ لغات قرآن کے پردے میں شیطان کو کمک بہم پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ یہ مارِ آستین ہیں جو اپنے فاد فکر و نظر سے امّتِ مسلمہ کو نقصان پہنچانے کے لئے پوری طرح کوشاں ہیں"۔][8]

اصلاحی صاحب کارویّہ، منکرین حدیث ہی کی ہم نوائی:

گذشتہ چند مثالوں سے واضح ہے کہ جو لوگ مغربی تہذیب کو مشرف بہ اسلام کرنا چاہتے ہیں وہ احادیث کو نظر انداز کر کے قرآن کے نام پر اپنا یہ ایجنڈا پورا کر رہے ہیں۔ اسلامی تہذیب کی تشکیل میں حدیث کا کردار بنیادی ہے۔ اس بنیاد کو درمیان سے نکال دیا جائے تو پھر قرآن سے لغت کے ذریعے سے اور باطل تاویلات کے زور پر جو چاہے ثابت کرنا اور عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنا آسان ہو جاتا ہے۔ منکرینِ حدیث قرآن کی آڑ میں یہی کچھ کر رہے ہیں۔

اصلاحی صاحب کارویّہ بالکل مذکورہ گروہوں کی طرح تو نہیں ہے لیکن ایک تو وہ خود بھی منکرینِ حدیث کی طرح حدیث کو ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہیں۔ دوسرے، اپنے خود ساختہ اور مزعومہ نظریات کے اثبات کے لئے احادیث کو نظر انداز کر کے عربی لغت ہی کا سہارا لیتے ہیں۔ اس طرح کم و بیش کے فرق کے ساتھ وہ منکرین حدیث ہی کے ہم نوا قرار پاتے ہیں۔

حدّ رجم کی متفق علیہ اور متواتر روایات کا انکار کر کے اپنے خود ساختہ نظریہ رجم بطور تعزیر کے لئے انہوں نے بھی قرآن کے لفظ "تقتیل" سے بہ زعم خویش عربی گرامر اور لغت ہی کا سہارا لیا ہے۔

ایک دوسری مثال: کسی عورت کو یکے بعد دیگرے تین طلاقیں مل جائیں، یعنی وہ عورت مبتوتہ (طلاق بتّہ کی حامل) ہو جائے تو ایسی عورت کا نکاح اب اسی خاوند سے دوبارہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے باقاعدہ ہمیشہ آباد رہنے کی نیّت سے نکاح کرے، پھر اتفاقیہ اس کو وہاں سے طلاق مل جائے یا زوج ثانی فوت ہو جائے تو اس کا دوبارہ نکاح پہلے خاوند سے کرنا جائز ہو گا۔ اس کے لئے قرآن کے الفاظ یہ ہیں

:[حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ](البقرہ-230)"یہاں تک کہ وہ زوج اوّل کے علاوہ کسی اور سے نکاح کرے"۔

اس آیت میں نکاح کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ عربی لغت میں نکاح کے دو معنی ہیں۔ پہلا عقد نکاح۔ دوسرا، وطی (ہم بستری) کرنا۔ حدیث کی رو سے یہاں نکاح بمعنی وطی (ہم بستری کرنا) ہے۔ حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق بتّہ دے دی، ان کی بیوی نے ایک دوسرے شخص (عبد الرحمٰن بن زبیر رضی اللہ عنہ) سے شادی کر لی۔ لیکن عورت ان سے مطمئن نہ ہو سکی اور ان کے درمیان (بغیر ہم بستری کے) جدائی ہو گئی، وہ عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور صورت حال سے آگاہ فرمایا، آپ نے اس کی گفتگو سے اندازہ فرما لیا کہ یہ عورت اپنے پہلے خاوند ہی سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتی ہے۔ لیکن آپ نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ جب تک دونوں ایک دوسرے کا مزہ نہ چکھ لیں،

عورت پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں: "لا حتی یذوق عسیلتک و تذوق عسیلتہ] "9[

اس حدیث نے قرآن کریم کے لفظ نکح کے معنی متعین کر دئے کہ یہاں نکاح کا لفظ صرف عقدِ نکاح کے لئے نہیں، بلکہ وطی کے معنی میں ہے۔ لیکن اصلاحی صاحب نے اس حدیث کو ردّ کر کے یہاں نکاح بمعنی عقد نکاح لیا ہے۔]10[

تفسیر "تدبّرِ قرآن" میں اور بھی بعض مثالیں ایسی ہیں جہاں واضح حدیث کو نظر انداز کر کے لغوی معنی یا اپنا خود ساختہ مفہوم مراد لیا ہے۔ شاید اس کی کچھ مزید تفصیل آگے آئے۔ ہمارا یہاں صرف اصلاحی صاحب کی منکرینِ حدیث کی ہم نوائی کو واضح کرنا مقصود ہے۔ اور وہ الحمدُ للہ واضح ہے۔

مسلّمہ اصطلاحات کے مفہوم میں تبدیلی، ان کا انکار ہے:

اس تفصیل سے واضح ہے کہ مسلّمہ اصطلاحات کے مفہوم میں تبدیلی، ان کا انکار ہے۔

اس کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

' 'ختمِ نبوّت ایک اصطلاح ہے جو قرآن مجید کے لفظ خاتم النبیین سے مستفاد ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں، آپ پر وحی و رسالت کا خاتمہ فرما دیا گیا۔ اب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اور یہ اصطلاح قرآن و حدیث کی نصوص صریحہ پر مبنی ہے اور اہلِ سنّت کے ہاں مسلّم ہے۔

لیکن مرزائی کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا بلکہ اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مہر کے بغیر کوئی نبی نہیں آسکتا اور مرزائے قادیانی پر آپ کی مہر لگی ہوئی ہے اس لئے مرزائے قادیان بھی (نعوذُ باللہ) سچا نبی ہے۔

ذرا سوچئے کہ ان مذکورہ شرعی اصطلاحات کی نئی تعبیر کرنے والے کیا صلوٰۃ، زکوٰۃ اور ختمِ نبوت کے ماننے والے کہلائیں گے یا ان کے منکر؟ ظاہر بات ہے کہ کوئی باشعور مسلمان ایسے لوگوں کو ان مسلّمات اسلامیہ کا ماننے والا نہیں کہے گا، بلکہ یہی کہے گا کہ یہ نماز کے بھی منکر ہیں، زکوٰۃ کے بھی منکر ہیں اور ختمِ نبوت کے بھی منکر ہیں۔ وعلیٰ ھٰذا القیاس دوسرے گمراہ فرقوں کی اپنی وضع کردہ اصطلاحات ہیں۔

سنّت اور حدیث، اہلِ سنت کی مسلّمہ اصطلاح ہے:

اس طرح سنت یا حدیث بھی شرعی اصطلاح ہے۔ علاوہ ازیں یہ صحابہ اور تابعین (سلف) اور محدثین کے نزدیک ایک ہی چیز ہے۔ اس کا مفہوم و مصداق بھی چودہ سو سال سے مسلّم چلا آرہا ہے۔ اس کو جو اس کے مسلّمہ مفہوم و مصداق کے مطابق مانے گا، وہ اس کو ماننے والا تسلیم کیا جائے گا اور جو یہ کہے گا کہ میرے نزدیک سنّت کا یہ مفہوم ہے اور حدیث کا یہ مفہوم ہے اور وہ مفہوم اس کا خود ساختہ اور مسلّمہ مفہوم کے یکسر خلاف ہے تو وہ حدیث و سنت کا ماننے والا نہیں کہلا سکتا، چاہے وہ زبان سے حدیث و سنت کو ماننے کا ہزار مرتبہ بھی دعویٰ کرے۔ جیسے مرزائی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ختمِ نبوّت کے قائل ہیں، لیکن وہ منکر ہی کہلائیں گے کیونکہ وہ ختمِ نبوّت کا وہ مفہوم نہیں مانتے جو مسلّمہ ہے، بلکہ خود ساختہ مفہوم کی روشنی میں مانتے ہیں۔

اس وضاحت کی روشنی میں جہاں پرویزی حدیث کے منکر ہیں، وہاں اسی کے منہج پر چلنے والے فراہی، اصلاحی اور غامدی اور دیگر ان کے ہم نوا بھی منکرِ حدیث ہی قرار پاتے ہیں۔

ھذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب

[2]اس کی پوری تفصیل اور مدلل ردّ کے لئے ملاحظہ ہو، راقم کی دو کتابیں. "حد رجم کی شرعی حیثیت" اور "فتنہ غامدیت"۔

[3]دیکھئے۔ "مبادئ تدبر حدیث." اور مقدمہ تفسیر تدبر قرآن

[4]میزان-از جاوید احمد غامدی، ص14، طبع سوم، 2008

[5]سلیم کے نام ۱۵۳/۱۵۱

[6]طلوع اسلام، جولائی 1966ء، ص62

[7]طلوعِ اسلام، فروری 1971ء-ص39- ستمبر 1983ء، ص36

[8]ماہنہ "محدث" لاہور، نومبر 2012ء، ص105-112

[9]صحیح بخاری، الطلاق، حدیث:5260

[10]ملاحظہ ہو: تدبّرِ قرآن، جلد اوّل، ص493-495

## (11) حقوقِ نسواں ! عورت کے ساتھ حسن معاشرت کی تاکید

بیوی کے حسن سلوک کی تفصیل اور اس کی بابت مرد کی ذمہ داریاں

عورت کے ساتھ حسن معاشرت کی تاکید

اسلام نے عورت کے ساتھ حسن سلوک کی بھی بڑی تاکید کی ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں معاشرت بالمعروف کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے:

**وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ**

**النساء.519.5**

" "تم ان کے ساتھ اچھے طریقے سے گزر بسر کرو۔"

جس کا مطلب، عورت کے حقوق کی صحیح ادائیگی، اس کی ضروریات زندگی (نان ونفقہ، لباس) کی فراہمی اور اپنے وسائل کے مطابق اسے ہر طرح کی آسانی اور سہولتیں بہم پہنچانا ہے۔ اس سلسلے کی متعدد احادیث اس سے قبل "مرد اور عورت دونوں کی خدمات کا دائرۂ کار" "

عنوان کے تحت بیان ہو چکی ہیں۔ یہاں چند احادیث اور ملاحظہ فرمائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

**'وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، إِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ اِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا'**

**صحیح بخاری کتاب النکاح باب الوصاۃ بالنساء، حدیث نمبر: 5186**

" "عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت قبول کرو، اس لیے کہ عورت کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اس کا بالائی حصہ ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ بیٹھو گے (لیکن سیدھا نہیں

کر سکو گے حتی کہ معاملہ طلاق تک پہنچ جائے گا) اور اگر تم اسے چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھا ہی رہے گا (یعنی عورت کی فطری کجی کبھی ختم نہیں ہو گی، اس لیے اس کو برداشت کرتے ہوئے) اس کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ (اس کے ساتھ نباہ کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے)۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کے حقوق کی اتنی فکر تھی کہ حجۃ الوداع کے خطبے میں بھی آپ نے اس کی تاکید فرمائی۔ آپ نے فرمایا:

'أَلَا وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّمَا هُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ لَيْسَ تَمْلِكُونَ مِنْهُنَّ شَيْئًا غَيْرَ ذَلِكَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ، فَإِنْ فَعَلْنَ فَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ، وَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ، فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا، أَلَا إِنَّ لَكُمْ عَلَى نِسَائِكُمْ حَقًّا وَلِنِسَائِكُمْ عَلَيْكُمْ حَقًّا، فَأَمَّا حَقُّكُمْ عَلَى نِسَائِكُمْ فَلَا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ مَنْ تَكْرَهُونَ وَلَا يَأْذَنَّ فِي بُيُوتِكُمْ لِمَنْ تَكْرَهُونَ، أَلَا وَحَقُّهُنَّ عَلَيْكُمْ أَنْ تُحْسِنُوا إِلَيْهِنَّ فِي كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ'

جامع الترمذی، حدیث: 1163

' 'سنو! تم عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت قبول کرو، بلاشبہ وہ تمہارے پاس قیدی ہیں (تم ہی ان کے سب کچھ ہو اور وہ تمہارے رحم و کرم پر ہیں) اس کے علاوہ تم ان کی کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے۔ ہاں اگر وہ کھلی بے حیائی (بدزبانی و بدسلوکی) کا ارتکاب کریں تو تم ان سے بستروں میں علیحدگی اختیار کر لو اور ان کو اس طرح ہلکی مار مارو جس سے ان کو شدید ضرب نہ آئے۔ اگر (اس حکمت عملی سے وہ ٹھیک ہو جائیں) تمہاری باتیں مان لیں تو تم ان کے لیے کوئی اور راستہ نہ ڈھونڈو (طلاق نہ دو)۔ یاد رکھو! تمہارے لیے تمہاری عورتوں پر حق ہیں اور اسی طرح تمھاری عورتوں کے لیے تم پر حق ہیں۔ تمہارا حق عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر ایسے لوگوں کو نہ آنے دیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھروں میں ان کو اِذنِ باریابی نہ دیں جن کو تم اچھا نہیں سمجھتے۔ سنو! اور ان

عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے لباس اور خوراک میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو (اس میں کوتاہی نہ کرو)۔"

یہ ارشادِ مبارک بھی بڑا جامع ہے اور اس میں ازدواجی زندگی میں پیش آنے والے نشیب و فراز کے بارے میں بڑی مفید ہدایات دی گئی ہیں جن پر اگر میاں بیوی صدق دل سے عمل کریں تو پیدا ہونے والی پیچیدگیاں آسانی سے سلجھ سکتی ہیں اور اخلاق و کردار کی کوتاہیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ ازدواجی زندگی کو خوش گوار بنانے کا یہی اصول ہے کہ دونوں میاں بیوی اولاً ایک دوسرے کے حقوق صحیح طریقے سے ادا کریں تاکہ کوئی ناخوشگوار مرحلہ ہی نہ آئے لیکن کسی کی کوتاہی سے اگر ایسا مرحلہ آ ہی جائے تو مذکورہ فرمان رسول میں بتلائی ہوئی حکمت عملی کو بروئے کار لا کر اس کا ازالہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

معاملات میں زیادہ بگاڑ، جس سے گھر اجڑ جاتے ہیں، اسی وقت آتا ہے کہ جب چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرنے یا ان کو مناسب حکمت عملی سے سلجھانے کے بجائے، سخت اور نامناسب رویہ اختیار کیا جائے اور ان کو بڑھایا جائے۔ اس سے ایک چنگاری شعلہ بن جاتی ہے اور گھر بھسم ہو کر رہ جاتا ہے۔

بگاڑ کا ایک اور سبب مرد کا قوت برداشت اور صبر و دانائی سے کام لینے کے بجائے جلد بازی اور اپنی حاکمیت و قوامیت کا بے اعتدالی سے استعمال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر قوّام بنایا ہے، اس قوّامیت کا تقاضا ہے کہ وہ صنف نازک کی فطری کمزوری اور کجی کو حکمت و دانائی سے برداشت کرے نہ کہ کمزور کے مقابلے میں اپنی قوت کا مظاہرہ کرے۔ اس قوت مردانگی کا بے جا استعمال بھی اکثر گھروں کے آرام و سکون کو برباد کر دیتا ہے۔

مذکورہ احادیث میں مرد کو یہی نکتہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کے مقابلے میں اللہ نے مرد کو عقل و شعور اور جسمانی قوت زیادہ عطا کی ہے، اس اعتبار سے گھر کو آباد رکھنے میں اس کی ذمے داری بھی زیادہ ہے، اس کو ہر وقت حکمت و دانائی اور صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ جو مردانِ حق آگاہ اس نکتے کو سمجھ لیتے ہیں، وہ عورت میں موجود اس کی خوبیوں کی قدر کرتے اور کمزوریوں اور کوتاہیوں کو برداشت کرتے ہیں، نتیجتاً ان کی ازدواجی زندگی پر سکون گزرتی اور گھر جنت کا نمونہ بنا رہتا ہے اور جو مرد اس کے برعکس رویہ اختیار کرتے اور عورت کی خوبیوں کو نظر انداز کر کے اس کی فطری کجی (ٹیڑھی پسلی) کو سیدھا کرنے کی ناکام سعی کرتے ہیں، وہ اپنا گھر اجاڑ بیٹھتے ہیں۔

حسن معاشرت کے لیے چند رہنما اصول

عورت کے ساتھ حسن معاشرت کی جو تاکید ہے، وہ پچھلے صفحات میں آپ نے پڑھ لی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر وہ رہنما اصول بھی بیان کر دیے جائیں جن پر عمل کرنے سے حسن معاشرت کا اہتمام آسانی سے ہو سکتا ہے اور اس کے تقاضے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ یہ رہنما اصول حسب ذیل ہیں، یہ دراصل مرد کے ذمے وہ حقوق ہیں جو اس پر عورت کی طرف سے عائد ہوتے ہیں، ان حقوق کی پوری رعایت اور ادائیگی سے حسن معاشرت کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔

لیجیے! ملاحظہ فرمائیے۔

حق مہر کی ادائیگی

سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ پوری خوش دلی سے حق مہر ادا کیا جائے، اس میں قطعاً نہ کوتاہی کی جائے اور نہ اس میں بلاوجہ تاخیر۔ تاہم عورت رضامندی

سے اپنا یہ حق مہر معاف کر دے تو بات اور ہے، عورت ایسا کر سکتی ہے لیکن بلا جبر و اکراہ، اپنی رضامندی سے۔ اگر عورت یہ ایثار کرے تو مرد سے یہ ذمے داری ساقط ہو جائے گی۔

**وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا**

**سورۃ النساء آیت نمبر 4**

’’اور تم عورتوں کے حق مہر خوشی سے ادا کرو، اگر وہ خوشی سے اس میں سے کچھ معاف کر دیں تو تم اسے رچتا پچتا کھالو۔‘‘

خوبیوں پر نظر رکھی جائے

ضروری نہیں کہ ہر مرد کو اس کی پسند اور خواہش کے مطابق بیوی مل جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو سبحان اللہ۔ اللہ کا شکر ادا کرے۔ بصورت دیگر اس پر نہ گھٹن محسوس کرے اور نہ اس سے نفرت و کراہت کا اظہار۔ بلکہ نوشتۂ تقدیر سمجھ کر اسے برداشت کرے اور اس کے حقوق ادا کرے، ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اسی میں اس کے لیے بہتری کا سامان پیدا کر دے، اس سے اللہ تعالیٰ اولاد صالح عطا فرما دے جو اس کے لیے دین و دنیا کی سعادت کا باعث بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

**وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ**

**البقرۃ216**

’’ہو سکتا ہے جس چیز کو تم ناپسند کرو، وہ تمھارے لیے بہتر ہو۔‘‘،

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے:

’’کوئی مومن مرد کسی مومنہ عورت (بیوی) سے بغض دلی نفرت نہ رکھے، اگر اس کے اندر کوئی ناپسندیدہ چیز ہے تو کوئی دوسری چیز پسندیدہ بھی ہو گی۔‘‘(؟)

مطلب یہ ہے کہ ہر انسان میں اچھائی اور برائی دونوں ہی ہوتی ہیں۔ اس لیے نباہ کا طریقہ یہی ہے کہ برائیوں کو نظر انداز کر کے اچھائیوں (خوبیوں) پر نظر رکھی جائے۔ انسان کو اپنے والدین، اولاد، بہن بھائیوں کے معاملے میں بھی یہی اصول اپنانا پڑتا ہے، اس کے بغیر چارہ نہیں، ورنہ انسان کا مذکورہ رشتوں کا نبھانا بھی ناممکن ہو جائے۔

بیوی کے لیے بھی اسی اصول کو سامنے رکھا جائے تو بیوی کے ساتھ، اس کی بعض ناپسندیدہ باتوں کے باوجود نباہ آسان ہو جاتا ہے اور اس صبر و ضبط کے صلے میں اس کو اللہ تعالیٰ دین و دنیا کی بہت سی سعادتوں سے بھی نواز دیتا ہے۔

کسی بھی اختلاف کو انا اور وقار کا مسئلہ نہ بنایا جائے

گھریلو معاملات میں، رشتے داروں کے معاملات میں، حتیٰ کہ اپنے ہی بچوں کے معاملات میں میاں بیوی کے درمیان اختلاف ہوتا رہتا ہے اور خانگی زندگی اکثر و بیشتر اسی طرح گزرتی ہے، الا ماشاء اللہ۔ اگر کسی وقت یہ اختلاف شدت اختیار کر جائے تو مرد کو چاہیے کہ وہ صبر و تحمل اور درگزر سے کام لے اور کسی بھی اختلاف یا مسئلے کو اپنی انا اور وقار کا مسئلہ نہ بنائے۔ انا اور وقار کا مسئلہ بنا لینے سے وہ اختلاف ختم یا کم نہیں ہوتا بلکہ اس کی شدت و وسعت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور بہت سی خرابیوں اور مسائل کا باعث بن جاتا ہے۔ اور اگر اپنی انا کو دبا کر افہام و تفہیم اور تواضع سے کام لیا جائے تو بڑے سے بڑا اختلاف بھی ختم یا کم ہو جاتا ہے اور کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنے سے اتفاق رائے پیدا ہو جاتا ہے۔

بیویوں کو بھی اختلاف رائے اور مشورے کا حق دیں

بعض مرد نہایت خود پسند ہوتے ہیں، وہ کسی کو بھی اختلاف رائے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگ اپنے

آپ ہی کو عقلِ کل سمجھتے اور بیوی کی رائے کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ہر معاملے میں اپنی من مانی کرتے اور گھر میں ڈکٹیٹرشپ (آمریت) نافذ کرتے ہیں۔

یہ رویہ بھی خوش گوار ماحول کے منافی ہے جب کہ گھریلو زندگی کی خوش گواری کے لیے ماحول کی خوش گواری نہایت ضروری ہے اور ایسا تب ہی ہو سکتا ہے کہ مرد بیوی کو زندگی کا دوسرا پہیہ سمجھے، جیسا کہ وہ واقعتاً ہے، اور ہر اہم معاملے میں اس کو اعتماد میں لے کر فیصلہ

کرے اور اس سے مشاورت کا اہتمام کرے، اس کے دلائل سنے اور اپنے دلائل اس کو سنائے، اس طرح زیر بحث مسئلے کے سارے پہلو سامنے آجائیں گے جس کی روشنی میں بہتر فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں ذیل کی حدیث سے ہمیں کافی رہنمائی ملتی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "ا۔'

' 'اللہ کی قسم! ہم زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، حتی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بابت وہ احکام نازل فرمائے جو (اسلام نے عورتوں کی بابت دیے۔) اور ان کو بہت سی رعایتیں دیں (جس سے ان کے اندر اعتماد اور گھریلو معاملات میں اختلاف رائے کا شعور پیدا ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) ایک مرتبہ میں اپنی بیوی کو کسی بات کا حکم دے رہا تھا کہ (اس نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا) اگر آپ یہ کام اس اس طرح کر لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں نے اس سے کہا: تجھے میرے معاملے میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟ اور میرے حکم سے سرتابی کیوں کرتی ہے؟ اس نے مجھ سے کہا: ابن خطاب! آپ پر مجھے تعجب ہے، آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بات پر بحث و تکرار نہ کی جائے، حالانکہ آپ کی بیٹی (ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث و تکرار کرتی ہے جس کی

وجہ سے (بعض دفعہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سارا دن اس سے ناراض رہتے ہیں۔"

[3] صحیح البخاري، حدیث:4913

اسلام نے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور لطف وکرم کا معاملہ کرنے کا جو حکم دیا ہے، اس کے نتیجے میں مسلمان عورت کے اندر جو شعور اور اعتماد پیدا ہوا، جس پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی ازواج مطہرات کے معاملے میں عمل کیا، اس کی ایک جھلک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کو اہمیت نہ دینا اور استبداد رائے کا مظاہرہ کرنا یکسر غلط اور حسن معاشرت اور اسوۂ رسول کے خلاف ہے۔

کسب معاش، یعنی سرمائے کی فراہمی مرد کی ذمے داری ہے

اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت، دونوں کو الگ الگ مقاصد کے لیے تخلیق کیا ہے اور اسی مقصد تخلیق کے تحت دونوں کو جسمانی، ذہنی اور دماغی صلاحیتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف عطا کی ہیں۔ پھر اس کے مطابق دونوں کا دائرۂ کار بھی متعین فرما دیا ہے۔ عورت کا دائرۂ کار گھر کی چار دیواری ہے جہاں وہ خانگی امور (کھانے پکانے، صفائی دھلائی وغیرہ) بچوں کی دیکھ بھال، ان کی تربیت ونگرانی، گھر کی حفاظت اور خاوند کے مال کی حفاظت اور خاوند کی خدمت وغیرہ کی ذمے دار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو صلاحیتیں بھی ایسی ہی دی ہیں کہ وہ یہ سارے امور نہایت خوش اسلوبی سے سر انجام دے لیتی ہے۔

اسی لیے اس کو حکم ہے:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ

الأحزاب 33

’’تم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو۔‘‘

مرد کا دائرۂ کار بیرون در، یعنی گھر سے باہر کے امور ہیں، گھریلو نظام چلانے اور ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے لیے معاشی جدوجہد اس کی ذمے داری ہے، وہ تجارت کرے، کھیتی باڑی کرے، ملازمت کرے، گھر کا سودا سلف لائے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے امور اسی کے ذمے ہیں۔

اللہ نے مرد کی قوامیت کی ایک وجہ اس کا کسب معاش کا ذمے دار ہونا بتلائی ہے اور دوسری وجہ جو وہبی، یعنی اللہ کی عطا کردہ ہے، وہ عورت کے مقابلے میں اس کا عقلی و دماغی صلاحیتوں میں عورت سے ممتاز ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ

النساء:34

’’مرد عورت پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے مال خرچ کئے ہیں۔‘‘

میں اسی نکتے کو بیان فرمایا ہے۔

ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ہم میں سے کسی شخص کی بیوی کا اس پر کیا حق ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَنْ تُطْعِمَهَا إِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوَهَا إِذَا اكْتَسَيْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ، وَلَا تُقَبِّحْ وَلَا تَهْجُرْ إِلَّا فِي الْبَيْتِ

’’جب تو کھائے، اسے بھی کھلا، جب تو پہنے، اسے بھی پہنا، اس کے چہرے پر نہ مار، نہ اسے برا بھلا کہہ اور اس سے علیحدگی اختیار کرنی پڑے تو گھر کے اندر ہی کر (نہ اس کو گھر سے نکال اور نہ خود گھر سے نکل۔‘‘

ایک اور حدیث میں بیوی بچوں پر خرچ کرنے کو زیادہ اجر و ثواب کا باعث قرار دیا۔ فرمایا:

دِيْنَارٌ أَنْفَقْتَهُ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَدِينَارٌ أَنْفَقْتَهُ فِي رَقَبَةٍ، وَدِينَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهِ عَلَى مِسْكِينٍ، وَدِينَارٌ أَنْفَقْتَهُ عَلَى أَهْلِكَ أَعْظَمُهَا أَجْرًا الَّذِي أَنْفَقْتَهُ عَلَى أَهْلِكَ [5] صحیح مسلم حدیث:995

''ایک دینار وہ ہے جسے تونے جہاد پر خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جسے تونے کسی غلام کی آزادی پر خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جسے تونے کسی مسکین پر صدقہ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تونے اپنے بیوی بچوں پر خرچ کیا، ان سب میں سے زیادہ اجر کا باعث وہ دینار ہے جو تونے اپنے بیوی بچوں پر خرچ کیا۔"

ایک دوسری حدیث میں اہل و عیال پر خرچ کردہ دینار کو "افضل دینار" قرار دیا۔ فرمایا:

أَفْضَلُ دِينَارٍ يُنْفِقُهُ الرَّجُلُ، دِينَارٌ يُنْفِقُهُ عَلَى عِيَالِهِ [6] صحیح مسلم حدیث:994

''سب سے افضل دینار، جو آدمی خرچ کرے، وہ دینار ہے جو وہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے۔"

انسان اگر اس نیت سے کمائے کہ میں نے وہ فریضہ ادا کرنا ہے جو اللہ نے مجھ پر بیوی بچوں کے نان نفقہ کے بارے میں عائد کیا ہے اور اس میں صرف حلال ذرائع ہی اختیار کرے، تو اس کا یہ کمانا اور اہل و عیال کو کھلانا سب صدقہ (نیکی ہی نیکی) بن جاتا ہے۔

إِنَّ الْمُسْلِمَ إِذَا أَنْفَقَ عَلَى أَهْلِهِ نَفَقَةً، وَهُوَ يَحْتَسِبُهَا كَانَتْ لَهُ صَدَقَةٌ [7] صحیح مسلم حدیث:1002

''مسلمان جب ثواب کی نیت سے اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرتا ہے تو وہ سب صدقہ (نیکی) بن جاتا ہے۔"

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ بیوی بچوں کی کفالت کی ساری ذمے داری مرد کی ہے عورت اس سے یکسر فارغ ہے۔ اس لیے کسی مرد کو بھی اپنی بیوی کو ملازمت اور محنت مزدوری کے لیے مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ نے اس کو گھر کی ملکہ بنایا ہے، اس کے اس اعزاز کو برقرار رکھا جائے، لوگوں کی ناز برداری کروا کر یا افسروں کا حاشیہ بردار بنا کر اس

کی بے توقیری نہ کی جائے اور نہ اس کو گھر سے نکال کر اس کی عصمت و تقدس کو خطرے میں ڈالا جائے۔

عورت کی عزت جس طرح گھر کے اندر رہنے میں ہے، اسی طرح مرد کی عزت گھر سے باہر نکل کر کسب معاش کے لیے محنت وجدوجہد کرنے میں ہے۔ جو مرد نکھٹو بن کر گھر میں بیٹھے رہتے ہیں یا دوستوں کے ساتھ گپ شپ ہی کو مقصد زندگی بنائے رکھتے ہیں اور اہل وعیال کے نان نفقہ کی ذمے داری سے غافل رہتے ہیں جس کی وجہ سے مجبوراً عورت کو اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں یا پھر اپنے میکے کے سہارے زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے، ظاہر بات ہے ایسے مردوں کا رویہ حسن معاشرت کے یکسر منافی ہے۔ حسن معاشرت کا تقاضا یہ ہے کہ مرد بہ رضا ورغبت اپنی بیوی بچوں کی کفالت کی ذمے داری بہ طریق احسن ادا کرے۔

خرچ میں اعتدال اور میانہ روی ضروری ہے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اخراجات کے معاملے میں اسلام کی اعتدال پر مبنی تعلیمات کی طرف بھی کچھ اشارہ کر دیا جائے کیونکہ ہمارے معاشرے میں ہر معاملے میں افراط وتفریط کا سلسلہ عام ہے۔

معاشیات اور مالیات میں بھی یہ افراط وتفریط اکثر وبیشتر دیکھنے میں

آتی ہے۔ کہیں اسراف وتبذیر ہے تو کہیں کنجوسی اور بخل کی انتہا۔ اسلام میں یہ دونوں رویے ناپسندیدہ ہیں۔

بیوی بچوں کے نان ونفقے پر کس طرح خرچ کیا جائے، اس کے لیے اسلام نے کسی حد کا تعین نہیں کیا ہے بلکہ انصاف پر مبنی ایک نہایت اہم اصول یہ بیان فرمایا ہے۔:

لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ الطلاق7

’’خوش حال آدمی اپنی خوش حالی کے مطابق (بیوی بچوں پر) خرچ کرے اور جسے رزق کم دیا گیا ہو، وہ اس مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔‘‘

دوسرا اصول یہ بیان فرمایا ہے:

وَّكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ

الأعراف:31

’’کھائو پیو اور اسراف فضول خرچی نہ کرو، بلاشبہ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔‘‘

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ﴿٢٦﴾ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ﴿٢٧﴾

سورہ بنی الاسرائیل آیت نمبر 26تا27

’’فضول خرچی مت کر، یقینا فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بہت ہی ناشکرا ہے۔‘‘

قرآن نے فضول خرچی کے لیے اسراف اور تبذیر دو لفظ استعمال کیے ہیں۔ دونوں لفظ ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے پر بولے جاتے ہیں اس لیے دونوں کے معنی فضول خرچی کے کیے جاتے ہیں۔ بعض اس میں فرق کرتے ہی ہیں، وہ کہتے ہیں:

اسراف کے معنی ہیں، حد سے نکل جانا۔ اس لیے ہر چیز میں حد سے نکل جانا اسراف ہے۔ کھانے پینے، یعنی ضروریات زندگی پوری کرنے میں حد سے تجاوز کرنا بھی اسراف ناپسندیدہ ہے۔ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'كُلُوا وَاشْرَبُوا وَالْبَسُوا وَتَصَدَّقُوا فِي غَيْرِ إِسْرَافٍ وَلَا مَخِيلَةٍ'

صحیح البخاری: کتاب اللباس، باب قول اللہ تعالیٰ: قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ۔

' 'کھائو، پیو، پہنو اور صدقہ کرو۔ البتہ دو باتوں سے گریز کرو، اسراف اور تکبر سے۔"

صدقے میں تو اسراف پسندیدہ ہونا چاہیے کیونکہ اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا مطلوب ہے، لیکن اس حدیث میں صدقے میں بھی اسراف سے روکا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن کی آمدنی تھوڑی ہے، وہ صاحب حیثیت نہیں ہیں۔ ان کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ پہلے اپنے اہل وعیال کی ضروریات پر خرچ کریں، اس کے بعد دیگر مدات خیر پر خرچ کریں اور وہ بھی اتنی مقدار میں جس سے نفقات واجبہ متاثر نہ ہوں۔ ایسے لوگوں کے لیے حکم ہے کہ وہ صدقہ بھی اپنی مالی پوزیشن کے مطابق ایک حد تک ہی کریں، اس سے تجاوز نہ کریں۔ ورنہ اصحاب حیثیت کے لیے تو اجازت ہے کہ وہ جتنا چاہیں اللہ کی راہ میں خرچ کر سکتے ہیں بلکہ ان کو تو خوب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم ہے۔

اور تبذیر کے معنی، ناجائز امور میں خرچ کرنا ہیں، چاہے تھوڑا ہی ہو۔ بہر حال جائز امور میں بھی فضول خرچی کی اجازت نہیں ہے۔ جب کہ ناجائز امور میں تو خرچ کرنے کی قطعاً اجازت ہی نہیں ہے۔

فضول خرچی سے ممانعت، افراط کی ممانعت ہے جو ہمارے معاشرے میں زندگی کے ہر شعبے میں عام ہے بلکہ یہ افراط (فضول خرچی) ہمارا قومی شعار بن چکی ہے۔

اس کے مقابلے میں تفریط (کوتاہی) ہے یعنی ضرورت کے مطابق بھی خرچ نہ کرنا بلکہ تنگ دلی، کنجوسی اور بخل کا مظاہرہ کرنا۔ بعض لوگ اس مرض میں بھی مبتلا ہوتے ہیں اور اس کا مظاہرہ وہ اپنے اہل وعیال کے معاملے میں بھی کرتے ہیں۔ بیوی کو پورا خرچ نہ دینا، ایک ایک پائی کا اس سے حساب لینا۔ یا گھریلو سامان خود لاکر دینا تو وہ پورا لاکر نہ دینا۔ یا بیوی کو حسب ضرورت کچھ خریدنے کے لیے جیب خرچ بھی مہیا نہ کرنا، اخراجات کے معاملے میں بیوی پر اعتماد نہ کرنا اور معمولی معمولی اخراجات کے لیے بھی اس کا خاوند کے رحم وکرم کا محتاج ہونا، وغیرہ۔ یہ ساری صورتیں بخل اور کنجوسی کی ہیں جو ناپسندیدہ ہیں۔

ایسے خاوندوں کی بیویاں جب میکے (کچھ دنوں کے لیے اپنے والدین کے ہاں) جاتی ہیں تو بالکل خالی ہاتھ جاتی ہیں، خاوند ان کو جیب خرچ دینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ وہ والدین کے ہاں معمولی معمولی ضروریات کے لیے بھی والدین ہی سے رقم لینے پر مجبور ہوتی ہیں۔ والدین کے ہاں ان کی حیثیت مہمان کی ہوتی ہے اور والدین حتی الامکان حسب استطاعت اپنی مہمان بیٹیوں اور نواسے نواسیوں کی مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے حتی کہ بچوں کی ضروریات کے لیے بھی کچھ خرچ کرنا پڑے تو وہ دریغ نہیں کرتے۔ لیکن ایسے خاوندوں کو سوچنا چاہیے کہ ان کا یہ رویہ اخلاقاً اور شرعاً صحیح ہے؟ آخر شادی کے

بعد بیوی بچوں کے نان ونفقہ کا مکمل ذمے دار خاوند ہے۔ اس کی بیوی چند دنوں کے لیے ماں باپ کے پاس جائے تو بلاشبہ اس کو کھلانا پلانا تو مہمان نوازی کا ایک حصہ ہے اور ماں باپ یہ فریضہ نہایت خوش دلی سے ادا کرتے ہیں۔ لیکن کیا بیوی کو یا بچوں کو دوائی کی ضرورت ہو، یا بچوں کے بعض اضافی اخراجات ہوں۔ کیا ان کے لیے بھی رقم مہیا کرنا والدین کی ذمے داری ہے؟ نہیں، یقیناً نہیں۔ اس کا ذمے دار خاوند ہے۔ اگر وہ بیوی کو خالی ہاتھ میکے چھوڑ کر جاتا ہے تو یقیناً وہ کنجوسی اور بخیلی کے علاوہ بداخلاقی کا بھی مظاہرہ کرتا ہے اور اپنے سسرال پر وہ ناروا بوجھ ڈالتا ہے جس کے ذمے دار وہ نہیں ہیں، بلکہ خاوند ہے، گو وہ خاموشی سے اضافی خرچ بھی پورا کر دیں لیکن خاوند کی یہ کنجوسی اور بد اخلاقی ان کے لیے بار خاطر ضرور بنتی ہے اور بیوی کے لیے بھی شرمندگی کا باعث، اگر بیوی حساس اور سمجھ دار ہو۔

بہر حال بعض لوگوں کا یہ رویہ کنجوسی اور بخیلی کی انتہا ہے جو حسن معاشرت، حسن اخلاق کے منافی اور شریعت سے متجاوز ہے۔

اسلام میں ان دونوں انتہاؤں کے درمیان کفایت شعاری کی تلقین ہے۔

شریعت اسلامیہ میں نہ اسراف پسندیدہ ہے اور نہ کنجوسی اور بخیلی۔ بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ فضول خرچی کے مقابلے میں حزرسی اور کفایت شعاری کو پسند کرتا ہے لیکن کفایت شعاری کا مطلب بخل نہیں، بلکہ حد سے تجاوز نہ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

**وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾**

**سورہ بنی اسرائیل\الاسراء آیت نمبر 29**

’’اور نہ رکھ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ بندھا ہوا اور نہ اسے کھول دے بالکل کھول دینا، کہ تو بیٹھ رہے ملامت کیا ہوا، تھکا ماندہ۔‘‘[بنی اسرائیل 17:29]

اس آیت کی تفسیر ’’احسن البیان‘‘ میں درج ذیل الفاظ میں کی گئی ہے:

’’اس میں انفاق (خرچ کرنے) کا ادب بیان کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان نہ بخل کرے کہ اپنی اور اپنے اہل عیال کی ضروریات پر بھی خرچ نہ کرے اور دیگر مالی حقوق واجبہ بھی ادا نہ کرے۔ اور نہ فضول خرچی ہی کرے کہ اپنی وسعت اور گنجائش دیکھے بغیر ہی بے دریغ خرچ کرتا رہے۔ بخل کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان ملوم یعنی قابل ملامت و مذمت قرار پائے گا اور فضول خرچی کے نتیجے میں محسور (تھکا ماندہ اور پچھتانے والا)۔

محسور، اسے کہتے ہیں جو چلنے سے عاجز آ چکا ہو، فضول خرچی کرنے والا بھی بالآخر خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ۔ یہ کنایہ ہے بخل سے۔ اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے۔ یہ کنایہ ہے فضول خرچی سے۔]‘‘9[

بیوی کے لیے مناسب تفریحی مواقع فراہم کرنا

بیوی کے ساتھ خوش طبعی اور اس کی تفریحِ طبع کے مواقع پیدا کرنا، یہ بھی حسن معاشرت کا ایک حصہ ہے۔ لیکن اس کا سروسامان بھی شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی کرنا ہے نہ کہ اس سے تجاوز کر کے، نیز اپنی وسعت کے مطابق نہ کہ اس سے بڑھ کر، جس سے وہ خود زیر بار ہو جائے۔

جیسے آج کل ٹی وی ڈراموں، فلموں اور تھیٹر کے فحش مزاحیہ ڈراموں کو تفریح کا سامان سمجھا جاتا ہے، اس کے لیے گھروں میں ٹی وی، وی سی آر اور کیبل اور نیٹ وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے یا سینمائوں یا تھیٹر ہالوں (الحمراء وغیرہ) کا رخ کیا جاتا ہے۔

لیکن یہ سب شیطانی تفریح ہے کیونکہ ان میں قدم قدم پر شریعت سے تجاوز ہے، ان میں ہیجان انگیز جنسی مناظر اور حرکات سے شہوانی جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے، فحاشی وعریانی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور مرد وزن کا بے باکانہ اختلاط ہوتا ہے اور اس طرح کی متعدد قباحتوں اور غیر شرعی حرکتوں کا وہاں ارتکاب ہوتا ہے۔

شریعت کی نظر میں مذکورہ چیزیں "تفریح طبع" کا نہیں، خباثت وکثافت اور شیطنت کی مظہر ہیں، ان سے بے حیائی، فحاشی اور مغرب کی حیا باختہ تہذیب کا فروغ ہو رہا ہے۔ اس لیے ان کا گھروں میں رکھنا جرم عظیم ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دنیا و آخرت میں شدید وعید بیان فرمائی ہے:

لَّيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴿٢٩﴾

**سورۃ النور آیت نمبر 29**

' 'جو لوگ اہل ایمان میں بے حیائی پھیلنے کو پسند کرتے ہیں، ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔"

جب بے حیائی کے پھیلنے کو پسند کرنے والوں کے لئے اتنی سخت وعید ہے تو جو خود اپنے گھر والوں میں اس کو پھیلانے کے ذمہ دار ہیں وہ کتنی سخت وعید کے مستحق ہونگے؟ اسی طرح دور دراز کی تفریحی مقامات پر بیوی بچوں کو لے جانا بھی ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔ یہ تفریح صرف وہ لوگ برداشت کر سکتے ہیں جن کے پاس وسائل کی فراوانی ہے، ایسے لوگ بیوی بچوں سمیت ایسے مقامات پر جا سکتے ہیں اور وہاں

شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے وہاں کے حسین قدرتی مناظر اور روح افروز شادابی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

اور جو وسائل فراواں سے محروم ہیں، وہ مقامی باغات اور تفریح گاہوں میں حسب ضرورت جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اور بھی جو مناسب تفریح کے مواقع اور طریقے ہیں، انھیں اختیار کیا جا سکتا ہے جس کے بعض نمونے ہمیں اسوۂ رسول میں بھی ملتے ہیں۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش مزاجی اور خوش طبعی کی ایک مثال یہ ملتی ہے کہ ایک مرتبہ سفر میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ تنہائی میسر آئی تو) آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کیا، حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

' 'رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک یا خیبر سے واپس تشریف لائے تو میرے طاقچے کے آگے پردہ پڑا ہوا تھا، ہوا چلی تو اس نے پردے کا ایک حصہ ظاہر کر دیا جس سے (طاقچے میں پڑے ہوئے) میرے کھلونے اور گڑیاں نظر آنے لگیں، آپ نے پوچھا: عائشہ! یہ کیا ہے؟ میں نے کہا: یہ میری گڑیاں ہیں۔ آپ نے ان میں کپڑے کا ایک گھوڑا بھی دیکھا جس کے دو پر تھے، آپ نے پوچھا: یہ کیا ہے جو میں ان کے درمیان دیکھ رہا ہوں؟ میں نے کہا: یہ گھوڑا ہے۔ آپ نے پوچھا: "اور اس کے اوپر کیا ہے؟" میں نے کہا: اس کے دو پر ہیں۔ آپ نے کہا: "کیا گھوڑے کے بھی پر ہوتے ہیں؟" عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: آپ نے سنا نہیں کہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھوڑوں کے پر تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: (یہ سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر ہنسے کہ میں نے آپ کی ڈاڑھیں دیکھیں۔]"10[

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چونکہ صغیر السن (کم سن) تھیں، اس لیے چھوٹی عمر کی بچیوں میں کھلونوں کے ساتھ (بالخصوص گڑے، گڑیائوں کے ساتھ) جو رغبت ہوتی ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اندر بھی یہ رغبت اور شوق تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مزاج وطبیعت کے مطابق ان کھلونوں پر کبھی کوئی اعتراض نہیں فرمایا اور ان کو ان کے ساتھ کھیلنے اور گھر میں رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ نیز محلے کی بچیاں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آکر کھیلا کرتی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا، خصوصاً عید اور خوشی کے موقع پر، اور وہ آکر قومی گیت بھی گایا کرتی تھیں۔] 11[

اس سے معلوم ہوا کہ بیوی کے مزاج ومذاق کے مطابق تفریح کی اشیاء بیوی کی دلجوئی اور دل داری کے لیے گھر میں رکھی جا سکتی ہیں بشرطیکہ شریعت میں ان کی اجازت ہو۔

دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ بچیاں اپنے ہاتھوں سے کھیل کود کے طور پر کپڑے کی جو گڑیاں بناتی ہیں، وہ جائز ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے منع نہیں فرمایا۔ البتہ آج کل جو مشینی گڑیاں (پلاسٹک وغیرہ کی) نکل آئی ہیں۔ جن میں سے بعض میں میوزک بھی لگا ہوتا ہے۔ نیز ان سے چھوٹے بچے کھیلتے ہی نہیں، بلکہ ان کو شو پیس کے طور پر شو کیسوں میں بطور سجاوٹ کے بھی رکھا جاتا ہے، ان کا جواز محل نظر ہے کیونکہ ہاتھ کی بنی ہوئی بے ہنگم سی گڑیا اور مشینی گڑیا، ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، اول الذکر کے جواز سے ثانی الذکر کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا، نہ ایک کو دوسرے پر قیاس ہی کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح خوشی کے موقع پر چھوٹی بچیاں ایسے گیت بھی گا سکتی ہیں جن میں آباء واجداد کی خدمات اور کارناموں کا تذکرہ ہو۔ کم سن (صغیر السن) بیویوں میں کھیل کود کی جو رغبت ہوتی ہے، اس کا ایک اور واقعہ احادیث میں ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ذوق اور شوق کی کس طرح رعایت فرمائی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

’’عید کا دن تھا، حبشی مسجد نبوی میں (ایک جنگی کتکہ بازی (کھیل، کرتب) اور نیزہ بازی کر رہے تھے، آپ نے مجھ سے پوچھا: تو اس کھیل کو دیکھنا پسند کرتی ہے؟‘‘ میں نے کہا: ہاں۔ پس آپ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کر لیا، میرا رخسار آپ کے رخسار پر تھا (کیونکہ آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پیچھے سے کاندھوں پر اٹھایا ہوا تھا) اور آپ کرتب بازوں کو فرماتے تھے۔

دُونَكُمْ يَا بَنِي أَرْفِدَةَ

’’شاباش، اے بنو ارفدہ (یہ حبشیوں کا لقب ہے)۔‘‘

(دُونَكُمْ، کلمۂ ترغیب ہے، یعنی آپ ان کو ہلا شیری دیتے تھے کہ کھیلو، خوب کھیلو)۔

یہاں تک کہ جب میں تھک گئی، تو پوچھا: ’’بس‘‘ میں نے کہا: ہاں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کہ جب تک میں خود نہیں تھک گئی آپ نے مجھے اپنی چادر سے پردہ کیے ہوئے اپنے کاندھے پر اٹھائے رکھا اور اپنے کھیل کود دیکھنے کے شوق پر اس طرح تبصرہ فرمایا:

فَاقْدُرُوا قَدْرَ الْجَارِيَةِ الْحَدِيثَةِ السِّنِّ الْحَرِيصَةِ عَلَى اللَّهْوِ[12] صحیح البخاری، حدیث 5236,950,454:

’ ’’تم اس نو عمر لڑکی کا اندازہ کرو جو کھیل کو دیکھنے کی اتنی شوقین ہے۔‘‘

اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر بیوی کم سن ہو تو خاوند کو خاص طور پر اس کی دل داری اور دل جوئی کا اور اس کی دلچسپی کے سامان کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مردوں کے ایسے کھیل، جن کا جواز شریعت نے تسلیم کیا ہے، ان کا دیکھنا عورتوں کے کے لیے جائز ہے، بشرطیکہ پردے کے تقاضے مجروح نہ ہوں۔

آج کل کرکٹ، ہاکی وغیرہ، جن کے بڑے بڑے میچ اور مقابلے ہوتے ہیں اور پوری قوم کو ان کو دیکھنے کا بخار چڑھا ہوتا اور ان کے نتیجے کا نہایت بے چینی سے انتظار ہوتا ہے، یہ کھیل سراسر ناجائز ہیں جن میں بے پناہ قومی وسائل ضائع کیے جاتے ہیں اور وقت کا ضیاع الگ۔ ان کا نہ کھیلنا جائز ہے اور نہ دیکھنا، سننا۔ نہ مردوں کے لیے اور نہ عورتوں بچوں کے لیے۔

اسلام میں صرف وہ کھیل جائز ہیں جن میں جنگی تربیت کا سامان ہو، جیسے گھوڑوں کا مقابلہ، نیزہ بازی، وغیرہ۔ انھی کھیلوں میں ایک کھیل بیوی کے ساتھ ملاعبت ہے یعنی اس کے ساتھ دل لگی اور پر لطف ہنسی مذاق، جس سے معاشرتی زندگی میں حسن اور خوش گواری پیدا ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی زبان مبارک سے اہلیہ کے ساتھ حسن معاشرت کی تمثیل

صحیح بخاری میں گیارہ عورتوں کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ وہ ایک جگہ جمع تھیں، انھوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا: ہر عورت اپنے اپنے خاوند کی صحیح صحیح تفصیل بیان کرے کہ وہ اخلاق و کردار کا کیسا ہے اور بیوی کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہے؟ تو ہر عورت نے اپنے اپنے خاوند کی بابت نہایت اختصار سے تفصیل

بیان کی، ان میں ایک عورت ام زرع تھی، اس نے اپنے خاوند ابو زرع کی بابت جو وضاحت کی اس میں اس کے خاوند اور اس کے بچوں وغیرہ کا کردار سب سے بہتر تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کی تفصیلات سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

'كُنْتُ لَكِ كَأَبِي زَرْعٍ لِأُمِّ زَرْعٍ'[13]صحیح البخاری، حدیث: 5189

' 'میں تیرے لیے ایسا خاوند ہوں جیسے ابو زرع ام زرع کے لیے تھا۔"

بیوی کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ نہ کرے

عورت خلقی اور جسمانی اعتبار سے مرد سے کمزور ہے، اسی لیے اسے صنف نازک سے تعبیر کیا جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ایک مرتبہ قواریر (آبگینے) قرار دیا ہے۔ آبگینہ (شیشہ) بھی نہایت نازک ہوتا ہے۔ ]14[

مرد اس کے مقابلے میں قوی الجثہ بھی ہے اور زیادہ ذہنی ودماغی صلاحیتوں کا حامل بھی۔ اسی لیے گھر کی قوامیت (حاکمیت) اسی کو عطا کی گئی ہے کیونکہ حاکمیت کے لیے قوت وطاقت بھی ضروری ہے اور ذہنی ودماغی صلاحیتوں کی فراوانی بھی۔ لیکن اس طاقت کا مطلب، کمزوروں پر دست درازی کرنا نہیں ہے بلکہ صبر وضبط کا مظاہرہ اور رحم وکرم کا معاملہ کرنا ہے۔

مردوں کی ایک معتد بہ تعداد اپنی اس خداداد طاقت کا غلط استعمال کرتی اور عورتوں پر ظلم وزیادتی کا ارتکاب کرتی ہے حالانکہ ظلم وزیادتی کا ارتکاب حسن معاشرت کے منافی ہے جب کہ حکم بیوی کے ساتھ حسن معاشرت (اچھا سلوک کرنے) کا ہے۔

ظلم کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً:

اس کے نان ونفقہ، یعنی ضروریات زندگی مہیا کرنے میں کوتاہی کرنا۔

اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے عورت پر ناروا پابندیاں لگانا، جیسے تو اپنے میکے نہیں جا سکتی، فلاں سے میل ملاپ نہیں رکھ سکتی، اس طرح کی دیگر پابندیاں جن کا شرعاً جواز نہ ہو۔

لڑکیوں کی مسلسل پیدائش پر، جس میں مرد کی طرح وہ بھی بے اختیار ہے، طلاق کی دھمکی دینا، یا اس کو اچھا نہ سمجھنا، اس کی بے عزتی کرنا، وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ لڑکے یا لڑکیاں دینا، یہ مکمل طور پر اللہ کے اختیار میں ہے، کسی انسان کی خواہش یا کوشش کا اس میں دخل نہیں۔ اس کے باوجود صرف عورت ہی کو اس کا ذمے دار ٹھہرا کر اس کو طعن و تشنیع کا اور ظلم وزیادتی کا ہدف (نشانہ) بنانا حماقت بھی ہے اور ظلم کا ارتکاب بھی۔

ایک ظلم یہ بھی ہے کہ مرد بعض دفعہ ناراض ہو کر بیوی سے بول چال بند کر دیتا ہے، یا اس سے جنسی تعلق قائم نہیں کرتا، یا اس کے اور بعض حقوق ادا نہیں کرتا، یا اس کی بابت قسم کھا لیتا ہے۔ ظاہر بات ہے ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے خاوند کی یہ بے رخی یا بائیکاٹ عورت کے لیے ناقابل برداشت ہے، شریعت اس ظلم کی کس طرح اجازت دے سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی بابت قرآن مجید میں فرمایا ہے:

لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ ۖ فَإِن فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٢٦﴾ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

سورہ البقرہ آیت نمبر 226 تا 227

’’جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں، ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے اور اگر وہ طلاق کا عزم کر لیں تو اللہ بہت سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔]"15[

اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں قطع تعلقی کی زیادہ سے زیادہ مدت کا تعین فرما دیا ہے، اور وہ چار مہینے ہے، اس کے اندر اندر وہ اپنا تعلق بحال کر لے ورنہ اس کے بعد اس کو طلاق دینی ہو گی۔ اس آیت کی تفسیر حسب ذیل ہے:

’’ایلاء" کے معنی قسم کھانے کے ہیں، یعنی کوئی شوہر اگر قسم کھا لے کہ میں اپنی بیوی سے ایک مہینہ یا دو مہینے (مثال کے طور پر) تعلق نہیں رکھوں گا۔ پھر قسم کی مدت پوری کر کے تعلق قائم کر لیتا ہے تو کوئی کفارہ نہیں۔ ہاں اگر مدت پوری ہونے سے قبل تعلق قائم کرے گا تو کفارۂ قسم ادا کرنا ہو گا۔ اور اگر چار مہینے سے زیادہ مدت کے لیے یا مدت کے تعین کے بغیر قسم کھاتا ہے تو اس آیت میں ایسے لوگوں کے لیے مدت کا تعین کر دیا گیا ہے کہ وہ چار مہینے گزرنے کے بعد یا تو بیوی سے تعلق قائم کر لیں یا پھر اسے طلاق دے دیں۔ (اسے چار مہینے سے زیادہ معلق رکھنے کی اجازت نہیں ہے) پہلی صورت میں (تعلق قائم کرنے) میں اسے کفارۂ قسم ادا کرنا ہو گا۔ اگر دونوں میں سے کوئی صورت اختیار نہیں کرے گا تو عدالت اس کو دونوں میں سے کسی ایک بات کو اختیار کرنے پر مجبور کرے گی کہ اس سے تعلق قائم کرے یا طلاق دے۔ تاکہ عورت پر ظلم نہ ہو۔]"16[

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام میں عورت کے ساتھ کسی بھی قسم کا بائیکاٹ کر کے اس کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ یہ عورت پر ظلم ہے۔ اگر غصے یا ناراضی میں خاوند ایسی کوئی بات کر بیٹھے تو اس کو زیادہ طول نہ دے بلکہ اس کو جلد از جلد ختم کر کے اپنا تعلق بحال کر لے، اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو ایک

متعینہ مدت کے بعد بذریعۂ عدالت عورت کو اس ظلم سے نجات دلوائی جائے گی۔

ایک ظلم زمانۂ جاہلیت میں عورتوں پر یہ کیا جاتا تھا کہ نہ ان کو صحیح طریقے سے آباد کیا جاتا تھا اور نہ طلاق دے کر ان کو آزاد کیا جاتا تھا، مرد عورت کو طلاق دیتا اور عدت گزرنے سے قبل رجوع کر لیتا، اور جس عورت کو تنگ کرنا اور اس کی زندگی کو اجیرن بنائے رکھنا مقصود ہوتا تو وہ عمر بھر اسی طرح طلاق دے دے کر رجوع کرتا رہتا۔

اسلام نے اس ظلم کا سدباب کرنے کے لیے ایسی طلاق کی، جس کے بعد عدت کے اندر رجوع جائز ہے، تعداد مقرر فرمادی کہ وہ صرف دو مرتبہ ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ

**البقرۃ:229**

یعنی زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ طلاق دے کر (عدت کے اندر) رجوع کیا جا سکتا ہے، دو مرتبہ حق طلاق استعمال کرنے کے بعد تیسری مرتبہ طلاق دی جائے گی تو رجوع اور صلح کا حق ختم، اور ہمیشہ کے لیے جدائی، حتی تنکح زوجا غیرہ۔

دوسری نصیحت مسلمانوں کو یہ فرمائی گئی کہ طلاق دینے کے بعد اگر رجوع اور صلح کی ضرورت ہو (جس کا اللہ نے دو مرتبہ موقع عطا فرمایا ہے) تو اس رجوع کا مقصد عورت کو تنگ کرنا، اس کو نقصان پہنچانا اور اس کے ساتھ زیادتی کرنا نہ ہو بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ اس کو آباد کرنا ہو۔

وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا

**البقرۃ231**

’’(طلاق دینے کے بعد عدت گزرنے سے قبل اگر تم ان کو رو کو یعنی صلح کرلو) تو تم ان کو نقصان پہنچانے کے لیے نہ رو کو تا کہ تم ان سے زیادتی کرو اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ یقیناً اپنے آپ ہی پر ظلم کرے گا اور تم اللہ کی آیتوں کو ہنسی مذاق نہ بنائو‘‘

کتنی سخت وعید ہے کہ ایسے مردوں کے لیے جو طلاق دے کر رجوع تو کرلیں لیکن بیوی کے حقوق ادا نہ کریں اور ان کے ساتھ ظلم وزیادتی کا رویہ جاری رکھیں۔ یہ ان کا اپنے نفس پر بھی ظلم ہے (کہ اس کو اللہ کے عذاب کا مستحق بنا رہے ہیں)۔ اور اللہ کے احکام کے ساتھ استہزاء ومذاق بھی ہے اور اس پر بھی وہ اللہ کی سزا کے متوجب قرار پا سکتے ہیں۔

عدل وانصاف کی تاکید

حسن معاشرت کے تقاضے عدل وانصاف کے اہتمام کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ اور اس کی دو موقعوں پر خاص طور پر بڑی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک جب کہ مشترکہ خاندان (جوائنٹ فیملی سسٹم) میں رہائش ہو۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دوسرے بہن بھائی، ان کی اولاد اور والدین سب ایک ہی مکان میں رہتے ہوں۔ وہاں بہن بھائیوں اور والدین کے حقوق کے ساتھ اپنی بیوی کا حق اس طرح ادا کرنا کہ نہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی ہو اور نہ بہن بھائیوں اور والدین کو یہ شکایت ہو کہ ان کے حقوق میں کوتاہی ہو رہی ہے۔

ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ہم میں سے کسی شخص کی بیوی کا اس پر کیا حق ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’أَنْ تُطْعِمَهَا إِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوهَا إِذَا اكْتَسَبْتَ أَوِ اكْتَسَبْتَ، وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ، وَلَا تُقَبِّحْ، وَلَا تَهْجُرْ إِلَّا فِي الْبَيْتِ‘[17]سنن أبي داود، حدیث:2124

'' 'جب تو کھائے، اسے کھلا، جب تو پہنے اسے پہنا، اس کے چہرے پر نہ مار، اسے برا بھلا نہ کہہ اور اس سے علیحدگی اختیار کرنی پڑے تو گھر کے اندر ہی کر۔''

اس حدیث پر صحیح معنوں میں عمل کرنا ہے، چاہے میاں بیوی علیحدہ ایک مکان میں رہتے ہوں یا مشترکہ خاندان کی صورت میں ایک مکان میں۔ دونوں صورتوں میں سب کے حقوق کے ساتھ بیوی کے ساتھ بھی حسن سلوک کے تقاضے مکمل طور پر ادا کرے۔

ہمارے معاشرے میں فیملی جوائنٹ سسٹم میں بھاوج نندوں اور ساس بہو کا مسئلہ بڑا

گھمبیر ہے لیکن اگر بیوی سگھڑ یعنی سلیقہ مند ہو اور وہ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت کے اصول کو اپنائے رکھے، اسی طرح گھر کے بڑے بھی بہو کو بیٹی والا پیار اور شفقت دیں، نندیں اس کو اپنی بہن والی حیثیت دیں۔ نیز خاوند بھی نہایت سوجھ بوجھ اور حکمت عملی کے ساتھ سب کو اپنے اپنے مقام پر رکھتے ہوئے سب کے حقوق کا خیال رکھے، نہ بڑوں کے کہنے پر بیوی کے حقوق میں کوتاہی کرے اور نہ بیوی کی محبت میں والدین کے ادب و احترام یا ان کے حقوق میں کوتاہی کرے، تو وہ گھر روایتی جھگڑوں سے محفوظ اور جنت نظیر بن جاتا ہے اور ایسا تب ہی ہوتا ہے جب خاوند سمیت چھوٹے بڑے سب حسن معاشرت (اچھے رویے) کا اہتمام کریں۔

دوسرا اہم موقع عدل و انصاف کرنے کا وہ ہے جب ایک شخص کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں، دو ہوں یا تین یا چار۔ ایسی صورت میں خاوند کے لیے عدل و انصاف کرنا پل صراط سے گزرنے کی طرح نہایت مشکل ہوتا ہے۔

لیکن شریعت نے جہاں کسی معقول ضرورت کی وجہ سے ایک سے زیادہ چار بیویوں تک کی اجازت دی ہے (نہ کہ حکم) وہاں دوسری طرف ان کے درمیان

عدل وانصاف اور مساوات کا بھی بڑی سختی کے ساتھ حکم دیا ہے، بصورت دیگر ایک ہی بیوی پر قناعت کرنے کی تاکید کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ﴿٣﴾

النساء3

" اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کے ساتھ گزارو کرو۔"

گویا ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت مشروط ہے عدل وانصاف کے ساتھ۔ اگر یہ شرط پوری نہیں کر سکتے تو دوسری عورت سے نکاح کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو ظاہر بات ہے کہ فطری طور پر خاوند کا دلی میلان کسی ایک کی طرف زیادہ ہوگا، یہ دل کا معاملہ ہے جس پر کسی کا اختیار نہیں ہے، لیکن کسی ایک بیوی کی محبت کا دل میں زیادہ ہونا یہ قابل گرفت ہے نہ عدل کے خلاف، بشرطیکہ یہ زیادہ محبت اس کو عدل وانصاف کے تقاضوں سے نہ روکے۔ عدل وانصاف اور مساوات کے حکم کی رو سے خاوند تمام بیویوں کے ساتھ لباس، خوراک اور دیگر ضروریات زندگی میں ان کے درمیان امتیاز نہیں کرتا، سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتا اور سب کو ایک سی سہولتیں مہیا کرتا ہے۔ اسی طرح میاں بیوی کے خصوصی تعلقات کی ادائیگی میں بھی مساوات کا اہتمام کرتا ہے۔ سب کے پاس باری باری جاتا ہے، کسی کی باری پر اس کو محروم کر کے دوسری کے پاس نہیں جاتا۔ اس کے اس ظاہری انصاف سے عدل ومساوات کے وہ تقاضے یقیناً پورے ہو جاتے ہیں۔ جو شرعاً مطلوب ہیں، چاہے اس کے دل میں کسی ایک بیوی کی محبت زیادہ ہی ہو۔ لیکن محبت کی اس زیادتی نے اس کو دوسری

بیوی یا بیویوں کی حق تلفی پر مجبور نہیں کیا تو پھر یہ زیادتی محبت عند اللہ مذموم نہیں ہو گی کیونکہ یہ دل کا معاملہ ہے اور دل میں سب بیویوں کی محبت یکساں نہیں ہو سکتی، تو جو چیز انسان کے اختیار سے باہر ہو، اس پر عند اللہ مؤاخذہ نہیں ہو گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنی تمام ازواج مطہرات میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ پیار تھا، اس لئے آپ نے اگرچہ باریاں بھی مقرر فرما رکھی تھیں (جس کی آپ پوری پابندی فرماتے تھے۔) اور عدل کا بھی پورا اہتمام فرماتے تھے:

لیکن چونکہ دل میں محبت ایک بیوی کی زیادہ تھی، اس لیے

آپ یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِي فِيمَا أَمْلِكُ، فَلَا تَلُمْنِي فِيمَا تَمْلِكُ وَلَا أَمْلِكُ"[18]

" "یا اللہ! جن چیزوں میں میرا اختیار ہے، ان میں میں نے یہ باریاں مقرر کر رکھی ہیں۔ پس تو مجھے اس چیز پر ملامت نہ کرنا جس پر تیرا ہی اختیار ہے، میں اس میں بے اختیار ہوں۔"

زیادہ بیویوں والے خاوند کے لیے خطرناک امر جو ہے، وہ یہ ہے کہ کسی ایک بیوی کی محبت، دوسری بیویوں کی حق تلفی کا باعث بن جائے اور وہ دوسری بیوی یا بیویوں کو معلقہ بنا کر رکھ دے، نہ ان کو طلاق دے کر آزاد کرے اور نہ ان کے حقوق ادا کرے۔

اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی زیادہ بیویاں رکھنے والوں کو تنبیہ فرمائی ہے:

[وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ] [النساء129]

" "اور تم سے یہ کبھی نہ ہو سکے گا کہ تم اپنی بیویوں میں ہر طرح سے عدل کرو، خواہ تم اس کی کتنی ہی خواہش رکھو، لہٰذا تم کسی ایک ہی کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ کہ دوسری کو بیچ میں لٹکتی چھوڑ دو۔"

بہر حال عورت کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کی کسی صورت میں اجازت نہیں ہے۔ ایک بیوی ہو تب بھی، ایک سے زیادہ ہو تب بھی۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا ایک بہت بڑی آزمائش ہے، بہتر ہے آدمی اس آزمائش میں نہ پڑے۔ اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے دوسری بیوی ناگزیر ہو تو اس رخصت سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ لیکن اس شرعی رخصت سے صرف دنیوی فائدہ ہی نہ اٹھائے، آخرت کی باز پرس کا بھی خیال رکھے جہاں وہی

شخص سرخ رو ہو گا جو عدل و انصاف کا اہتمام کرنے والا ہو گا۔

خانگی امور میں تعاون

حسن معاشرت کا ایک پہلو یہ بھی کہ مرد حسب ضرورت گھریلو امور میں بھی عورت کا ہاتھ بٹائے اور اس باہمی تعاون کو اپنے مردانہ وقار اور شان کے خلاف نہ سمجھے۔ اس سے بھی ازدواجی زندگی میں خوش گواری آئے گی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضرت اسود رحمہ اللہ نے پوچھا:

'مَا كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يَصْنَعُ فِي بَيْتِهِ؟'

' 'نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کیا کرتے تھے؟'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

'كَانَ يَكُونُ فِي مِهْنَةِ أَهْلِهِ تَعْنِي خِدْمَةَ أَهْلِهِ فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ][19]'

' 'آپ گھر والوں کی خدمت میں (گھریلو امور میں تعاون) کیا کرتے تھے۔ (اس دوران میں) اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو نماز کے لیے تشریف لے جاتے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کی شرح میں شمائل ترمذی کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے، یہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

'مَا كَانَ إِلَّا بَشَرًا مِنَ الْبَشَرِ، يَفْلِي ثَوْبَهُ، وَيَحْلِبُ شَاتَهُ، وَيَخْدِمُ نَفْسَهُ' وَلِأَحْمَدَ وَابْنِ حِبَّانَ مِنْ رِوَايَةِ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ 'يَخِيطُ ثَوْبَهُ، وَيَخْصِفُ نَعْلَهُ]'20[

' "آپ انسانوں میں سے ایک انسان ہی تھے، اپنے کپڑوں سے جوئیں خود ہی دیکھ لیتے، اپنی بکری کا دودھ دوہ لیتے، اپنا کام خود کر لیتے، اپنا کپڑا سی لیتے اور اپنی جوتی بھی گانٹھ لیتے تھے۔"

یعنی ہر کام اہلیہ ہی کے سپرد نہ کرتے، بلکہ چھوٹے موٹے کام خود بھی کر لیتے اور اس کو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھتے، جیسے آج کل کے مردوں کا شیوہ ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہمارے پیغمبر اتنی عظمت و شان کے باوجود بہت سے گھریلو امور خود ہی انجام دے لیا کرتے تھے اور اس میں کسر شان نہیں سمجھتے تھے، تو آپ کے مقابلے میں ہماری کیا حیثیت ہے؟ اس اسوۂ رسول کو اپنانے میں، جس میں معاشرتی زندگی کا حسن پیدا ہوتا ہے، ہم کیوں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں؟

محبت کا بھرپور اظہار

حسن معاشرت کا ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ جس طرح عورت کو یہ تاکیدی حکم ہے کہ مرد اس کو جب بھی اپنے پاس (خلوت میں) بلائے، وہ جس حالت میں بھی ہو، اس کی تعمیل کرے تاکہ مرد ادھر ادھر منہ نہ مارتا پھرے۔ اسی طرح مرد کی بھی ذمے داری ہے کہ وہ عورت کے ساتھ بھرپور محبت کا اظہار کرے۔ عورت کے اندر فطری طور پر شرم و حیا کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے، سوائے چند شہوت زدہ عورتوں کے۔ اس لیے وہ جنسی جذبات کی تسکین کے لیے بہت

کم مرد کے سامنے پہل کرتی ہے۔ عموماً مرد ہی پہل کرتا اور اس کو اس کام کے لیے بلاتا اور آمادہ کرتا ہے۔

اس لیے مرد کی ذمے داری ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ از خود بھرپور محبت کا اظہار کرے تاکہ اس کے اندر کوئی تشنگی نہ رہے اور وہ کسی اور کی طرف دیکھنے پر مجبور نہ ہو۔

اس کے لیے اس کو دو طریقے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

(1) اس کے ساتھ ہنسی مذاق اور دل لگی کے ذریعے سے اس کی دلجوئی و دل داری کا اہتمام کرتا رہے (جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو موقع ملتا تو عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کرتے، ان کو حبشیوں کے جنگی کرتب دکھا کر ان کی تفریح طبع کا سامان کرتے، ان کو گڑیوں اور چھوٹی بچیوں کے ساتھ کھیلنے کا موقع فراہم کرتے، وغیرہ وغیرہ)۔

اسی لیے ایک حدیث میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ آپ نے فرمایا:

'لَيْسَ مِنَ اللَّهْوِ إِلَّا ثَلَاثٌ، تَادِيبُ الرَّجُلِ فَرَسَهُ، وَمُلَاعَبَتُهُ أَهْلَهُ وَرَمْيُهُ بِقَوْسِهِ]'21[

' 'کھیل تین ہی ہیں۔ انسان کا اپنے گھوڑے کو سدھانا (جنگ کے لیے تیار کرنا) دوسرا، اس کا اپنی بیوی کے ساتھ کھیلنا، (ہنسی مذاق اور دل لگی کرنا) تیسرا، اس کا اپنے تیر کمان سے تیر پھینکنے کی مشق کرنا۔"

ان میں سے دو کھیلوں کا تعلق تو جنگی تیاریوں سے ہے جس سے مقصود مسلمانوں کو ہمہ وقت جہاد کے لیے تیار رکھنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے بامقصد کھیلوں کے علاوہ دوسرے تمام کھیل ناجائز ہیں کیونکہ ان میں وقت کا بھی ضیاع ہے اور وسائل کا بھی ضیاع۔ البتہ ان کے علاوہ بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق کو بھی ایک جائز کھیل تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ اس کا بھی ایک نہایت اہم فائدہ ہے اور وہ ہے

گھریلو زندگی کا خوش گوار ہونا، اس لیے شریعت نے اس کی بھی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ثیبہ (شوہر دیدہ عورت، مطلقہ یا بیوہ) کے مقابلے میں کنواری عورت سے شادی کرنے کی ترغیب دی ہے اور اس کی وجہ بھی یہ بیان فرمائی

ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلیں یعنی آپس میں دل لگی کریں اور ایک دوسرے سے وابستگی کا بھرپور اظہار کریں۔ ایک بیوہ کے ساتھ مرد اس طرح وابستگی کا اظہار نہیں کر سکتا جس طرح کنواری کے ساتھ کرتا ہے اور خود بیوہ بھی مرد کو اس طرح ٹوٹ کر نہیں چاہتی جیسے کنواری عورت سے متوقع ہوتا ہے۔

(1) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ عملی طور پر از خود بیوی سے اظہار محبت مختلف پیرایوں سے کرتا رہے، اس کا انتظار نہ کرے کہ بیوی کی طرف سے اظہار ہو۔ جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ وضو کی حالت میں بھی اپنی اہلیہ محترمہ کا بوسہ لے لیا کرتے تھے اور پھر نماز کے لیے تشریف لے جاتے، حتی کہ روزے کی حالت میں بھی بوسہ لے لیتے، اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ کو اپنے جذبات پر پورا کنٹرول حاصل تھا، یعنی آپ نے دوسروں کو متنبہ فرمایا کہ بلاشبہ روزے کی حالت میں بیوی سے بوس وکنار کی اجازت ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کرنا ثابت ہے، لیکن یہ عمل نوجوانوں کے لیے اور ایسے لوگوں کے لیے جن کو اپنے جذبات پر پورا کنٹرول نہ ہو، خطرناک بھی ہو سکتا ہے اور وہ جذبات کی رو میں بوسے کی حد سے تجاوز کر کے وہ کام کر بیٹھیں جس کا کفارہ دو مہینے کے روزے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔

تاہم عام حالات میں عام لوگوں کے لیے روزے کی حالت کے علاوہ دیگر حالات اور اوقات میں اظہار محبت اور تعلق خصوصی کے لیے مواقع موجود ہیں، خود رمضان میں بھی رات کو ان تمام باتوں کی اجازت ہے جن کا تعلق میاں بیوی کی خلوت سے ہے۔ غالباً اسی لیے شریعت میں یہ بھی اجازت ہے کہ حالتِ جنابت میں سحری کھا کر روزہ رکھا جا سکتا ہے۔ البتہ پھر نمازِ فجر کے لیے غسل کرنا ضروری ہے اور اس پر آسانی سے عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہ رخصت اسی لیے ہے کہ رمضان المبارک کی راتوں میں تعلقات زن و شوہر قائم کرنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ عبادت میں بھی ایسا غلو (زیادتی) ناپسندیدہ ہے جس سے عورت کی حق تلفی ہو اور وہ مقصد پورا نہ ہو جس کے لیے عورت سے نکاح کیا جاتا ہے، عورت ساری رات خاوند کی منتظر رہے اور میاں صاحب ساری رات نوافل اور عبادت میں گزار دیا کریں۔ حتی کہ عورت دن کے اوقات میں اس بات کی خواہش مند ہو لیکن عابد و زاہد خاوند کا دن بھی نفلی روزے میں گزرے اور وہ اس کو مستقل معمول بنا لے اور عورت کو گل دستۂ طاقِ نسیاں بنا دے۔ اسلام میں ایسے زہد اور عبادت کی اجازت نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کا یہ واقعہ پہلے گزر چکا ہے کہ وہ زیادہ عبادت و زہد کے اسی شوق میں بیوی کا حق ادا نہیں کرتے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات آئی تو آپ نے ان کو بلا کر پوچھا: کیا تم رات کو قیام کرتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو، کیا بات ایسے ہی ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں، ایسا ہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس طرح مت کرو، روزہ بھی رکھو اور روزہ چھوڑ بھی دیا

کرو۔ رات کو قیام بھی کرو اور سویا بھی کرو۔ اس لیے کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔]"22[

بہر حال حسن معاشرت کا ایک نہایت اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ عورت کو دیگر آسائشیں اور راحتیں بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس کی جنسی آسودگی کا بھی مکمل اہتمام ہو۔ حتیٰ کہ اگر آدمی اس میں کمزوری محسوس کرے تو اس کے لیے ڈاکٹر یا حکیم کے مشورے سے مقویات بھی استعمال کرتا رہے تاکہ عورت کو اس معاملے میں بھی تشنگی اور ناآسودگی کا احساس نہ ہو۔

عورت ہر حیثیت سے قابل احترام ہے

عورت کے ساتھ حسن معاشرت (اچھا برتاؤ کرنے) میں ان تصورات کو سامنے رکھا جائے اور ان کے مقتضیات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے جو اسلام نے عورت کی عزت و وقار کی بحالی کے لیے بیان کیے ہیں، تو ایک انسان عورت کے ساتھ بے رحمانہ، ظالمانہ اور سنگ دلانہ سلوک کا نہ تصور کر سکتا ہے اور نہ اس کو محض لذت اندوزی کا سامان سمجھ کر اسے اس کا اصل مقام دینے سے گریز کر سکتا ہے۔

اسلام میں عورت کی صرف چار حیثیتیں ہیں، وہ ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے اور بیوی ہے۔ ان میں سے ہر حیثیت سے وہ نہایت قابل احترام ہے۔

ماں ہے تو باپ سے بھی زیادہ قابل احترام ہے اسی لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے اس سوال پر کہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِي، آپ نے فرمایا: "تمہاری ماں۔" اس نے سوال کیا، اس کے بعد کون؟ آپ نے فرمایا: تمہاری ماں، اس نے پھر پوچھا: اس کے بعد کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمہاری ماں" اس نے

پھر پوچھا: اس کے بعد کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمہاری ماں“ چوتھی مرتبہ سوال کرنے کے بعد فرمایا: ”تمہارا باپ۔] “23[

ماں، باپ سے بھی زیادہ حسن سلوک کی مستحق کیوں ہے؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باپ کے مقابلے میں ماں کو تین مرتبہ سب سے زیادہ حسن سلوک کا مستحق

قرار دیا۔ اس کی توجیہ میں شارحین حدیث نے فرمایا ہے کہ ماں کے زیادہ استحقاق کی تین وجوہ ہیں۔

(1) نو مہینے تک حمل کی تکلیف برداشت کرنا۔

(2) وضع حمل (زچگی، ڈلیوری) کے مرحلے سے گزرنا جو عورت کے لیے موت وحیات کا ایک نہایت سنگین مرحلہ ہوتا ہے۔

(3) پھر دو سال تک رضاعت (بچے کو دودھ پلانا) راتوں کو اس کے لیے اٹھنا اور اس کی ضروریات اور صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا جب کہ وہ بول کر اپنی حاجت اور تکلیف بیان نہیں کر سکتا۔

ان تینوں مراحل کی جاں گداز تکلیفوں میں مرد کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، صرف ماں کا جذبۂ شفقت، جسے مامتا کہا جاتا ہے، اسے ان تکلیفوں کو برداشت کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور وہ ہنسی خوشی ان ذمے داریوں کو ادا کرتی ہے۔

بیوی گھر کی ملکہ اور گھر کی زینت ہے

اللہ تعالیٰ نے عورت کے اندر فطری طور پر ایسے اوصاف رکھے ہیں، جو مردوں سے مختلف ہیں، ان اوصاف کی وجہ سے وہ مذکورہ تینوں مشقتیں برداشت کر لیتی ہے، مرد عورت سے زیادہ قوت وطاقت کا مالک ہے لیکن اس کے باوجود مذکورہ مشقتیں اس کے لیے ناقابل برداشت ہیں، اس لیے مرد کی سمجھ داری کا تقاضا ہے

کہ وہ عورت کی ان مشقتوں پر ہمدردی سے غور کرے، اگر وہ ایسا کرے گا تو کبھی عورت کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ نہیں کرے گا۔

وہ سمجھ لے گا کہ میری یہ بیوی میرے بچوں کی ماں ہے اور ماں ہونے کے ناطے سے وہ ان کی خاطر وہ وہ تکلیفیں برداشت کر لیتی ہے جو میں نہیں کر سکتا۔ مزید برآں وہ میری خدمت گزار، میرے گھر کی محافظ، میری خواہشات کے خاکوں میں رنگ بھرنے والی اور مجھے سکون وراحت بہم پہنچانے والی ہے، میرے گھر کی ملکہ اور میرے گھر کی زینت ہے۔ اگر یہ میرے گھر سے نکل جائے تو گھر امن وسکون کا گہوارہ، مہر ومحبت کا مرکز اور عزت ووقار کا سنگم نہیں رہے گا بلکہ ایک بے آب وگیاہ صحرا میں تبدیل ہو جائے گا جہاں کوئی روئیدگی، شادابی اور بہجت و نشاط کی فرحت انگیزیاں نہیں ہوں گی۔ ایک جہنم کدے میں تبدیل ہو جائے گا جہاں زندگی کی رونق اور چہل پہل کے بجائے ویرانی اور جھلسا دینے والی بادسموم کا ڈیرہ ہو گا۔

عورت، بیٹی اور بہن کی حیثیت سے

بہر حال یہ گفتگو تو عورت کے ماں اور بیوی ہونے کی حیثیت سے تھی۔ لیکن جب وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں ہوتی ہے تو وہ ان کی بیٹی اور بھائیوں کی بہن ہوتی ہے اور ان دونوں حیثیتوں میں بھی وہ محترم ہوتی ہے اور احادیث میں ان دونوں کے پالنے اور ان کی تربیت کرنے کی بڑی فضیلت وارد ہے۔ بیٹی ماں باپ کی آنکھوں کا تارا اور دلوں کا دلارا ہوتی ہے، ماں باپ اسے شہزادیوں کی طرح ناز ونعمت سے پالتے اور اسے حسن تربیت سے آراستہ کرتے ہیں اور بہن کی حیثیت سے وہ بھائیوں کی مہر ومحبت اور ہمدردیوں کا مرکز ہوتی ہے اور وہ اس کو ہر طرح کا آرام وسکون بہم پہنچانے میں والدین کے ہم دم وہم راز ہوتے ہیں۔ بیوہ اور مطلقہ ہونے کی صورت میں بھی والدین یا بھائیوں کا گھر ہی اس کی مایوسیوں میں امیدوں کا مرکز اور تاریکیوں میں روشنی کا منبع ہوتا ہے۔

## مغرب میں عورت کی ذلت وخواری

اس کے برعکس مغرب میں عورت گرل فرینڈ ہے یا کسی افسر کی سٹینو گرافر یا سیکرٹری، کسی دفتر کی کلرک ہے یا کسی کارخانے کی ورکر (مزدور) ریسپشن گرل (استقبال کرنے والی چھوکری ہے) یا ائیر ہوسٹس (فضائی میزبان، جہازوں کے مسافروں کی خدمت کرنے والی اور ان کے دلوں کو لبھانے والی) یا ہسپتالوں میں مریضوں کی دیکھ بھال کرنے والی اور اپنے افسر ڈاکٹروں کی ناز برداری کرنے والی نرس۔ ہوٹلوں میں گاہکوں کو چائے اور شراب مہیا کرنے پر مامور اور ان کی نگاہ ہوس کا شکار بننے والی خادمہ۔ بلکہ بہت سے شراب خانوں میں ٹاپ لیس سروس پر مجبور، جس میں عورت کو اپنے جسم کا بالائی حصہ عریاں رکھنا پڑتا ہے تاکہ ان کی عریانی سے مردوں کی ہوس کی تسکین ہو سکے۔

مغرب کی یہ عورت اول تو نکاح سے پہلے ہی مردوں سے جنسی تعلقات کے نتیجے میں بن بیاہی ماں بن جاتی ہے اور شادی کے بعد بھی یہ ڈانس کلبوں میں غیروں کی باہوں میں جھومتی اور جھولتی ہے۔ اس کو کبھی نہ گھر کی ملکہ کا اعزاز حاصل ہوتا ہے اور نہ معاشرے میں وہ عزت ومقام جو اسلام نے عورت کو عطا کیا ہے۔ اس کے لیے ذلت ہی ذلت ہے اور قدم قدم پر مردوں کی غلامی ومحکومی، ایک شوہر کی غلامی، جس میں اس کا مکمل احترام ہے، اس کو قید لگتی ہے اور بے شمار ہوس زدہ مردوں کی غلامی، جس میں ذلت وخواری کے سوا کچھ نہیں، آزادی۔ یہ ہے وہ آزادئ نسواں جس کا مغرب علم بردار ہے۔

اسلام نے عورت کو ان تمام ذلتوں سے بچا کر مرد کو اس بات کا پابند بنایا ہے کہ اگر وہ

ماں ہے تو اس کی باپ سے بھی زیادہ خدمت کرو، بیٹی ہے تو نازو نعمت سے اس کی پرورش کرو اور اس کی آرزوؤں اور خواہشوں کے مطابق اس کا جیون ساتھی تلاش کر کے اس کے ساتھ اس کا نکاح کر دو۔ بہن ہے تو اس کے ساتھ بھی بیٹیوں کی طرح حسن سلوک کرو اور بیوی ہے تو اس کو گھر کی ملکہ بنا کر رکھو اور اس کی تمام ضروریات گھر بیٹھے پوری کرو اور اس کے آرام وراحت کا ہر سامان مہیا کرو۔ اس کو اپنی کسی بھی ضرورت کے پورا کرنے کے لیے گھر سے باہر نکل کر کسی دفتر، کارخانے یا فیکٹری میں کام کرنے کی ضرورت ہے نہ اس کو اس کی شرعاً اجازت ہے۔ سوائے سخت مجبوری کے۔

عورت بھی بہ حیثیت انسان کے مرد کے برابر ہے

عورت کے بارے میں اسلام سے قبل عرب کے لوگ ہی جاہلی تصورات نہیں رکھتے تھے جس کی بنا پر عرب معاشرے میں عورت عزت ووقار سے محروم تھی بلکہ عجم میں بھی عورت کی کوئی قدر ومنزلت نہیں تھی، اس کو پیروں کی جوتی کے ساتھ تشبیہ دی جاتی تھی، یا کہا جاتا تھا کہ اس کو مردوں کی غلامی اور چاکری کے لیے پیدا کیا گیا ہے یا وہ شیطان کی ایک آلۂ کار ہے جس سے شیطان انسانوں کو گمراہ کرنے کا کام لیتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اسلام نے ان تصورات کا خاتمہ کر کے اس کو عزت ووقار کا ایک نہایت اعلیٰ مقام عطا فرمایا اور اس کو بہ حیثیت انسان ہونے کے اس کی بعض امتیازی چیزوں سے قطع نظر مردوں کے مساوی قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ][البقرة228]

'' اور ان عورتوں کا (حق خاوندوں پر) اسی طرح ہے (جس طرح خاوندوں کا حق) ان عورتوں پر ہے اور ان مردوں کو ان پر کچھ فضیلت ہے۔''

یعنی بہ حیثیت انسان ہونے کے مرد اور عورت دونوں کے حقوق ایک جیسے ہیں جن کو پورے کرنے کے دونوں شرعاً پابند ہیں۔ نہ عورت، مرد کو انسانیت سے ماورا مقام کا حامل سمجھے کہ اس سے ایسے مطالبات کرے جن کا پورا کرنا انسانی طاقت سے بالا ہو اور نہ مرد عورت کو انسانی شرف و تکریم سے عاری مخلوق سمجھے کہ اس کے ساتھ جس طرح کا چاہے غیر انسانی سلوک کرکے اس کی عزت و وقار کو مجروح یا اس کے حقوق کو پامال کرے۔ دونوں کو شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے ہیں جو شریعت نے بتلائے ہیں۔

البتہ اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو ملحوظ رکھا جائے کہ گھر کا نظام چلانے کے لیے مرد و عورت میں سے مرد کو قوّام و حاکم اور عورت کو محکوم بنایا گیا ہے کیونکہ دونوں کو یکساں طور پر اگر حاکمیت کا حق دیا جاتا تو گھر کا نظام چل ہی نہیں سکتا تھا، جیسے ایک ملک میں ایک کے بجائے دو حکمران مساوی طور پر با اختیار ہوں تو نظم مملکت قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ نظم ایک ہی با اختیار حکمران کے ذریعے ہی قائم رہ سکتا ہے۔ اسی قوّامیت میں یہ بھی شامل ہے کہ مرد فطری قوتوں میں، جہاد کی اجازت میں، میراث کے دوگنا ہونے میں اور حقِ طلاق و رجوع (وغیرہ) میں عورت سے ممتاز ہے۔ یہی ایک گونہ وہ فضیلت ہے جو اللہ نے مرد کو عطا کی ہے جس کو قرآن کریم میں وللرجال علیھن درجۃ میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ ایک گونہ فضیلت یا امتیاز چونکہ ناگزیر تھا اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا:

[وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ] [النساء32]

’’اور اس چیز کی آرزو نہ کرو جس کے باعث اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، مردوں کا اس میں سے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لیے اس میں سے حصہ ہے جو انھوں نے کمایا اور اللہ سے اس کا فضل مانگو۔‘‘

اس آیت کی شان نزول میں بتلایا گیا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مرد جہاد میں حصہ لیتے ہیں اور شہادت پاتے ہیں، ہم عورتیں ان فضیلت والے کاموں سے محروم ہیں، ہماری میراث بھی مردوں سے نصف ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔] 24[

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے جو جسمانی قوت وطاقت اپنی حکمت وارادہ کے مطابق عطا کی ہے اور جس کی بنیاد پر وہ جہاد بھی کرتے ہیں اور دیگر بیرونی کاموں میں حصہ لیتے ہیں، یہ ان کے لیے اللہ کا خاص عطیہ ہے، اس کو دیکھتے ہوئے عورتوں کو مردانہ صلاحیتوں کے کام کرنے کی آرزو نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ اللہ کی اطاعت اور نیکی کے کاموں میں خوب حصہ لینا چاہیے اور اس میدان میں وہ جو کچھ کمائیں گی، مردوں کی طرح ان کا پورا پورا صلہ انھیں ملے گا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرنا چاہیے کیونکہ مرد اور عورت کے درمیان، استعداد صلاحیت اور قوت کار کا جو فرق ہے، وہ تو قدرت کا ایک اٹل فیصلہ ہے جو محض آرزو سے تبدیل نہیں ہو سکتا، البتہ اس کے فضل سے کسب ومحنت میں رہ جانے والی کمی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔] 25[

مرد کے بعض صلاحیتوں اور خصوصیات میں ممتاز ہونے کی حکمتیں

مرد اور عورت کے درمیان جو چند امتیازی چیزیں ہیں، اس کی ایک وجہ تو فطری صلاحیتوں کا وہ فرق ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان رکھا ہے جسے دنیا کی کوئی

طاقت ختم نہیں کر سکتی، کیونکہ اس کی وجہ وہ تخلیقی مقاصد ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں جن کی بنیاد پر عورت کا دائرۂ کار گھر کی چار دیواری ہے اور مرد کا دائرۂ کار گھر سے باہر (بیرونِ دَر) کے امور ہیں۔ جن میں امور جہاں بانی، جہاد اور کسب معاش وغیرہ ہیں، عورت ان تمام ذمے داریوں سے سبکدوش ہے۔ اسی میں عورت کی عزت بھی ہے اور اس کی عصمت و تقدس کا تحفظ بھی۔

عورت کو وراثت میں حصے دار بنانا، اس میں بھی عورت کی عزت و احترام کی بحالی ہے جس سے عورت اسلام سے قبل محروم تھی، ورنہ عورت کی جو ذمے داریاں ہیں، ان میں اس کو بالعموم مال کی ضرورت نہیں ہوتی، مال کی زیادہ ضرورت مرد ہی کو رہتی ہے، اسی نے کاروبار کرنا ہے، عورت کی معاشی کفالت اسی نے کرنی ہے، حق مہر بھی اسی نے ادا کرنا ہے، ولیمہ بھی کرنا اور دیگر شادی کے اخراجات ہیں جو مرد ہی نے برداشت کرنے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ذمے داری عورت پر نہیں ہے۔ اس لیے اس کو وراثت میں مرد کے دوگنا کے مقابلے میں ایک گنا حصے دار قرار دینا، اس کی عزت و احترام ہی کے پیش نظر ہے ورنہ اس کو مال کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

مرد کو طلاق و رجوع کا حق دینے میں بھی بڑی حکمت ہے اور وہ ہے گھر کو بربادی سے بچانا، عورت مرد کے مقابلے میں کم حوصلہ بھی ہے اور جذباتی بھی۔ اگر اس کو بھی طلاق کا حق مل جاتا تو اختلاف و نزاع کی صورت میں وہ فوراً طلاق دے کر اپنے پیروں پر کلھاڑی مار لیا کرتی اور خانماں برباد ہو جایا کرتی۔ مرد کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ حوصلہ و ہمت سے نوازا ہے اس لیے وہ زیادہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتا اور گھر بربادی سے محفوظ رہتا ہے۔ اگرچہ بعض مرد جہالت اور بے شعوری کی وجہ سے صبر و تحمل کے بجائے عجلت اور عاقبت نااندیشی

کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوری طور پر طلاق دے دیتے ہیں اور پھر بعد میں پچھتاتے ہیں لیکن اگر عورت کو بھی حق طلاق مل جاتا تو پھر طلاق کی شرح کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

عورت کو مارنے کی رخصت اور اس کی حکمت اور مطلب

جس طرح بعض مرد جہالت کی وجہ سے عورت کے حقوق صحیح طریقے سے ادا نہیں کرتے، تو اس میں اسلام کا تو کوئی قصور نہیں، ان مردوں کا قصور ہے جو اسلام کے عطا کردہ بعض مردانہ امتیازی حقوق کا، جو نہایت حکمت پر مبنی ہیں، غلط استعمال کرتے اور اسلام کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں، انھی میں سے یہ طلاق کا بھی حق ہے جسے بعض مرد نہایت غلط طریقے سے استعمال کرتے اور اپنا گھر اجاڑ لیتے ہیں جس کا خمیازہ عورت کے علاوہ ان کو بھی بھگتنا پڑتا ہے، بچے ہوں تو ان کو بھی۔

یا جس طرح اللہ تعالیٰ نے نشوز (عورت کی نافرمانی، سرکشی) کی صورت میں مرد کو اس کو سمجھانے کے لیے وعظ و نصیحت کرنے، اس سے بستر سے علیحدگی اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو مارنے کی بھی اجازت ہے۔

[وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاهْجُرُوْھُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ][النسآء34]

’’اور جن بیویوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو انھیں سمجھاؤ (اگر نہ سمجھیں) تو خواب گاہوں میں ان سے الگ رہو (پھر بھی نہ سمجھیں تو) انھیں مارو۔‘‘

تو یہ حق بھی گھر کے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ہے کیونکہ گھر کا قوّام (حاکم) مرد ہی ہے جس طرح کسی ملک یا علاقے کے قوّام (سربراہ یا حاکم مجاز) کو ملک یا علاقے کا نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے سختی کرنی پڑتی ہے، دار و گیر سے کام لینا پڑتا ہے اور سرکشوں کے سرِ پُر غرور کو کچلنے کے لیے ان کو زدو کوب بھی کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح مرد کو بھی عورت کو راہ

راست پر رکھنے کے لیے آخری چارۂ کار کے طور پر زدوکوب کرنے کی بھی اجازت دی گئی ہے تاکہ گھر میں مرد کی قوامیت (حاکمیت) بھی برقرار رہے اور گھر کا نظم ونسق بھی انتشار سے محفوظ رہے۔

لیکن مارنے کا یہ حق غیر محدود نہیں ہے لیکن چونکہ ناگریز حالات میں بطور علاج اس کی اجازت ہے اس لیے یہ مار وحشیانہ اور ظالمانہ نہ ہو، بلکہ علاج کی حد تک ہلکی مار ہو جس سے اس کو شدید چوٹ نہ آئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا:

'وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَنْ لَا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُونَهُ، فَإِنْ فَعَلْنَ ذٰلِكَ فَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ'[26]

' 'تمہارا عورتوں پر یہ حق ہے کہ وہ تمھارے بستروں پر ایسے کسی شخص کو آنے کی اجازت نہ دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو، اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو ایسی مار مارو جس سے ان کو زیادہ چوٹ نہ آئے۔"

ایسی مار جو بطور علاج ہو اور جس میں وحشیانہ پن نہ ہو، تو چونکہ اس کی اجازت ہے اس لیے اس پر قیامت کے دن باز پرس بھی نہیں ہوگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'لَا يُسْأَلُ الرَّجُلُ فِيمَا ضَرَبَ امْرَأَتَهُ'[27]

' 'آدمی سے اپنی عورت (بیوی) کے مارنے پر باز پرس نہیں کی جائے گی۔"،

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'لَا تَضْرِبُوا إِمَاءَ اللّٰهِ'

' 'اللہ کی باندیوں کو مت مارا کرو۔"

چنانچہ صحابۂ کرام بڑے محتاط ہوگئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاوندوں کے مقابلے میں ان کی جارتیں بڑھ گئیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آکر نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نتیجے سے آگاہ فرمایا تو آپ نے ان کو مارنے کی رخصت عنایت فرمادی۔ بعض صحابہ نے اس رخصت کا غلط استعمال کیا تو بہت سی عورتوں نے آکر ازواج مطہرات کے پاس ان کی شکایتیں کیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'لَقَدْ طَافَ بِآلِ مُحَمَّدٍ نِسَاءٌ كَثِيرٌ يَشْكُونَ أَزْوَاجَهُنَّ لَيْسَ أُولَئِكَ بِخِيَارِكُمْ'[28]

' "آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بہت سی عورتوں نے آکر اپنے خاوندوں کی شکایت کی ہے، یہ لوگ تم میں بہتر نہیں ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ یہ رخصت بے رحمانہ طریقے سے مارنے کی نہیں ہے اور جو ایسا کرے گا وہ بہتر لوگوں میں شمار نہیں ہوگا اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رخصت کی بڑے حکیمانہ انداز میں وضاحت فرمائی:

'لَا يَجْلِدُ أَحَدُكُمْ امْرَأَتَهُ جَلْدَ الْعَبْدِ ثُمَّ يُجَامِعُهَا فِي آخِرِ الْيَوْمِ'

' "تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو اس طرح نہ مارے جس طرح غلام کو مارا جاتا ہے، (کیونکہ یہ عجیب بات ہوگی کہ اس طرح مارنے کے بعد) پھر دن کے آخر میں اس سے ہم بستری کرے گا۔"

اسی لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر باب باندھا ہے:

'بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنْ ضَرْبِ النِّسَاءِ'

' "اس بات کا بیان کہ عورتوں کو مارنا ناپسندیدہ (مکروہ) ہے۔"

اور قرآن کریم میں مارنے کی رخصت (واضربوھن) کی تفسیر ان الفاظ میں فرمائی ہے: {غَيْرُ مُبَرِّحٍ} ایسی مار جس سے شدید چوٹ نہ آئے۔"[29]

اور یہی وہ تفسیر ہے جو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے جیسا کہ صحیح مسلم کے حوالے سے یہ حدیث گزری ہے۔

بہر حال مقصود اس تفصیل سے یہ ہے کہ ہلکی مار مارنے کی اجازت ایک خاص حکمت کے تحت دی گئی ہے کہ بعض عورتوں کے لیے بعض دفعہ یہ علاج مؤثر ہوتا ہے لیکن جو لوگ حقِ طلاق کی طرح اس کو بھی غلط استعمال کرتے ہیں تو یہ سخت ناپسندیدہ ہے اور ایسے لوگ اسلام کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ لوگ بہتر بھی نہیں ہیں اور عقل ودانش سے بھی بے بہرہ ہیں کہ مارتے بھی ہیں اور پھر اسی سے اپنی خواہش بھی پوری کرتے ہیں۔

عورت کو منحوس سمجھنا غلط ہے

حسن معاشرت کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ عورت کو منحوس نہ سمجھا جائے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب عورت نئی نویلی دلہن کی صورت میں آتی ہے تو چونکہ وہ یکسر ایک نئے ماحول میں آتی ہے، دولہا سمیت اس گھر کے سارے افراد اس کے لیے اجنبی ہوتے ہیں، اس کو اس نئے ماحول سے مانوس ہونے میں اور دولہا اور اس کے گھر والوں کے مزاجوں کو سمجھنے میں کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ اسی طرح دلھن بھی تمام افراد خانہ کے لیے اجنبی ہوتی ہے، اس کی خوبیاں (یا برائیاں) ظاہر ہونے میں بھی وقت لگتا ہے۔ چند ایام یا چند ہفتوں میں ایک دوسرے کی بابت اچھا یا برا ہونے کا نہ صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے اور نہ فیصلہ ہی۔

لیکن ہمارے معاشرے میں عجلت سے فیصلہ کرنے کا مرض عام ہے دلہن کے آنے کے بعد اگر اتفاقی طور پر کوئی حادثہ ہو جاتا ہے، یعنی کاروبار میں کچھ نقصان ہو جاتا ہے یا کوئی اور ارضی وسماوی آفت آجاتی ہے تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ نئی عورت جو ہمارے گھر میں آئی ہے، اس کی نحوست ہے اور پھر گھر کے سارے افراد اس کو منحوس باور کر لیتے ہیں۔

ظاہر بات ہے ایسا سمجھنا اور کہنا جہاں تقدیر الٰہی کے خلاف ہے جو کہ کمال ایمان کے منافی ہے، وہاں حسن معاشرت کے بھی خلاف ہے۔ قدرتی حوادث و آفات کا باعث عورت کو قرار دینا، جب کہ اس میں اس کے ارادے یا عمل کا کوئی دخل نہیں، یکسر خلاف واقعہ اور ایک پاک دامن کو نحوست سے متہم کرنا ہے اور جب اس کو منحوس سمجھ لیا جائے گا تو کون اسے اچھا سمجھے گا یا اس سے اچھا سلوک کرے گا؟

اس لیے حسن معاشرت کا تقاضا ہے کہ اتفاقی حوادث وواقعات کی بنیاد پر عورت کو یا کسی بھی چیز کو منحوس سمجھنا بے بنیاد بات ہے۔

نحوست کے تصور کی بنیاد

دراصل یہ تصور ایک حدیث سے غلط فہمی کے طور پر مشہور ہو گیا ہے، وہ حدیث ہے:

'الشُّؤْمُ فِی ثَلَاثَةٍ، فِی الْفَرَسِ، وَالْمَرْأَةِ، وَالدَّارِ'

' 'نحوست تین چیزوں میں ہے، گھوڑے میں، عورت میں اور گھر میں۔"

حالانکہ ایک دوسری حدیث سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے، وہ حسب ذیل ہے:

'إِنْ كَانَ الشُّؤْمُ فِی شَیْءٍ، فَفِی الدَّارِ، وَالْمَرْأَةِ، وَالْفَرَسِ]'30[

' 'اگر کسی چیز میں نحوست ہو سکتی ہے تو وہ گھر ہے، اور عورت ہے، اور گھوڑا ہے۔

یہ دونوں روایات امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب النکاح کے باب ما یتقی من شؤم المرأۃ وقولہ تعالیٰ [إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ] [التغابن 14] میں بیان کی ہیں۔

یعنی امام بخاری نے شؤم المرأۃ (عورت کی نحوست سے بچنے) کا باب باندھا اور اس میں قرآنی آیت بھی ساتھ بیان کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ عورت کا منحوس ہونا

کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ بعض عورتیں منحوس ہو سکتی ہیں جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

’’تمہاری بیویوں اور اولاد میں سے بعض تمہاری دشمن ہیں۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے مِن کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو تبعیض کے لیے بھی آتا ہے۔ یعنی ساری بیویاں یا ساری اولاد دشمن نہیں ہے بلکہ بعض ہیں۔ اور یہ واضح ہے کہ جو اولاد ماں باپ کی فرماں بردار اور خیر خواہ ہو، وہ ماں باپ کی دشمن نہیں ہے، صرف وہ اولاد دشمن ہے جو نافرمان اور گستاخ ہو۔ اور اللہ کا یہ فرمان واقعات کے عین مطابق ہے۔ اسی طرح وہ بیوی بھی جو فالصالحات قانتات حافظات للغیب کی مصداق ہو، وہ خاوند کی دشمن نہیں بلکہ وفادار، اطاعت شعار اور خیر خواہ ہو گی۔ اور جو اولاد اور بیوی نیک اور صالح ہو گی، ان کی بابت نحوست کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی باب میں یہ حدیث بھی ذکر کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

’مَاتَرَکْتُ بَعْدِی فِتْنَةً اَضَرَّ عَلَی الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ‘[31]

’’میں نے اپنے بعد عورتوں سے بڑھ کر کوئی فتنہ ایسا نہیں چھوڑا جو مردوں کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ ہو۔‘‘

اس حدیث سے بھی یہی نکتہ واضح ہوتا ہے کہ جو عورت فتنے کا باعث ہو، اس میں تو شر اور نحوست کا پہلو ہو سکتا ہے لیکن جو عورت ایسی نہ ہو بلکہ اس کے برعکس نیکی اور صالحیت کا پیکر ہو، تو اسے منحوس کیسے قرار دیا جا سکتا ہے اس کی طرف کسی تقدیری امر کے ظہور کی وجہ سے شر اور نحوست کو منسوب کرنا ایسا ہی ہے جیسے حدیث میں کہا گیا ہے کہ یہ کہنا کفر ہے کہ فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے۔ یعنی بارش برسانے کے فعل کو اللہ کے بجائے ستارے کی طرف

منسوب کرنا، یکسر غلط بلکہ کفریہ کلمہ ہے تو پھر مطلقاً عورت کو شر اور نحوست کا باعث قرار دینا کیوں کر صحیح ہے؟ جب کہ اس شر کے ظہور میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ ایک تقدیری معاملہ ہے جس کا ظہور اس عورت کے نئے گھر میں آنے کے بعد ہوا ہے۔ اور قضاوقدر کے فیصلے کا اس کے ساتھ توافق ہو گیا ہے۔

عدم موافقت ہو سکتی ہے لیکن صرف اللہ کی مشیت سے

یہ تو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ بعض دفعہ انسان گھر خرید تا یا کرائے پر لیتا ہے، سواری کے لیے کوئی جانور، یا آج کل کے حساب سے کوئی گاڑی وغیرہ لیتا ہے، اسی طرح کسی عورت سے شادی کرتا ہے۔ لیکن یہ چیزیں انسان کو راس نہیں آتیں، اس کو مسلسل نقصان اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کو یہ تو اجازت ہے کہ عدم موافقت کی وجہ سے گھر چھوڑ کر، جانور یا گاڑی بیچ کر، بیوی کو طلاق دے کر وہ متبادل انتظام کر لے لیکن ان کا تعلق نحوست سے جوڑ کر بد اعتقادی کا اظہار نہ کرے بلکہ اس کو قضاوقدر کا فیصلہ سمجھے۔ اس بارے میں بھی ایک حدیث سے ہمیں کافی رہنمائی ملتی ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

’’ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم ایک گھر میں رہتے ہیں، وہاں گھر کے افراد بھی کافی ہوتے ہیں اور مال و دولت کی بھی فروانی ہوتی ہے، لیکن ہم گھر بدل لیتے ہیں تو وہاں ہمارے افراد اور اموال میں کمی ہو جاتی ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اس گھر کو اپنے حق میں برا سمجھتے ہوئے چھوڑ دو۔]"32[

اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ شریعت اسلامیہ میں اس تصور کی نفی کی گئی ہے کہ کوئی بیماری متعدی بھی ہوتی ہے بلکہ اس عقیدے کی تاکید کی گئی ہے کہ اللہ کے حکم اور مشیت کے بغیر کسی کو کوئی بیماری نہیں لگ سکتی۔ اس کے باوجود ہمیں حکم دیا

گیا ہے کہ مجذوم (کوڑھی کے مریض) سے اس طرح بھاگو جس طرح تم شیر سے بھاگتے ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ نہیں کہ جذام کا مرض متعدی ہے بلکہ اس کی وجہ اعتقاد کی خرابی سے بچانا ہے۔ کیونکہ اگر کسی شخص کو مجذوم کے پاس بیٹھنے سے اگر جذام کی بیماری لاحق ہو گئی تو اس کی اصل وجہ تو اللہ کا حکم اور اس کی مشیت ہو گی لیکن اس شخص کے اندر عقیدے کی یہ خرابی پیدا ہو سکتی ہے کہ مجھے یہ بیماری اس مریض کے پاس بیٹھنے کی وجہ سے لاحق ہوئی ہے۔ یہ عقیدہ چونکہ اسلامی مسلّمات کے خلاف ہے اس لیے مسلمانوں کے عقیدوں کو محفوظ رکھنے کے لیے احتیاط کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ اس بدعقیدگی سے مسلمان محفوظ رہیں۔

اسی طرح عدم موافقت کی صورت میں زیر بحث مذکورہ اشیاء کو چھوڑا جا سکتا ہے لیکن اس ردوبدل میں ان کی نحوست کا عقیدہ نہ رکھا جائے بلکہ اس کو قضاو قدر کا فیصلہ ہی سمجھا جائے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ زیر بحث حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

’’یہ حدیث (لوگوں کی رائے کے برعکس) اس مفہوم کی تائید کرتی ہے کہ کسی چیز میں نحوست نہیں ہے۔ اس لیے کہ حدیث کے معنی ہیں: ”اگر نحوست کسی بھی چیز میں ثابت ہوتی تو ان تین چیزوں میں ہوتی لیکن بات یہ ہے کہ نحوست کسی بھی چیز میں یکسر ثابت ہی نہیں ہے۔ اور بعض روایات میں جو الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ ”نحوست تین چیزوں میں ہے“ یہ بعض راویوں کا اختصار اور تصرف ہے (ورنہ اصل الفظ یہی ہیں کہ اگر نحوست ہوتی تو ان میں ہوتی)۔]“33[

امام طحاوی رحمہ اللہ نے بھی یہی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں:

’’نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر نحوست کسی چیز میں ہوتی تو عورت، گھوڑے اور گھر میں ہوتی۔“ آپ نے یہ خبر نہیں دی کہ ان میں ہوتی ہے

بلکہ یہ فرمایا ہے: اگر نحوست کی چیز میں ہوتی تو ان میں ہوتی، یعنی اگر کسی چیز میں ہوتی تو ان میں ہوتی اور جب ان تینوں میں نہیں ہے تو کسی بھی چیز میں نہیں ہے۔]"34[

بعض احادیث اور آثار سے مذکورہ مفہوم کی تائید

ہمارے وضاحت کردہ نکتے کی تائید ذیل کی حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'أَرْبَعٌ مِنَ السَّعَادَةِ، اَلْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ، وَالْمَسْكَنُ الْوَاسِعُ، وَالْجَارُ الصَّالِحُ، وَالْمَرْكَبُ الْهَنِيئُ، وَأَرْبَعٌ مِنَ الشِّقَاءِ: اَلْجَارُ السُّوءُ وَالْمَرْأَةُ السُّوءُ، وَالْمَرْكَبُ السُّوءُ وَالْمَسْكَنُ الضَّيِّقُ]'35[

' 'چار چیزیں سعادت سے ہیں: نیک عورت، فراخ کشادہ گھر، نیک پڑوسی اور اچھی سواری، اور چار چیزیں شقاوت (بد بختی) سے ہیں: برا پڑوسی، بری عورت، بری سواری، اور تنگ مکان۔"

یعنی مذکورہ چیزیں کسی کے لیے سعادت کا اور کسی کے لیے شقاوت کا ذریعہ ہیں اور یہ سب کچھ اللہ کی مشیت اور اس کے قضا وقدر کے تحت ہے۔

اسی لیے بعض شارحین نے حدیث شؤم کی شرح میں لکھا ہے، جیسے امام خطابی ہیں:

'إِنْ كَانَتْ لِأَحَدِكُمْ دَارٌ يَكْرَهُ سُكْنَاهَا أَوِ امْرَأَةٌ يَكْرَهُ صُحْبَتَهَا، أَوْ فَرَسٌ يَكْرَهُ سَيْرَهُ فَلْيُفَارِقْهُ]'36[

' 'اگر کسی کا گھر ایسا ہے کہ اس میں رہائش اس کو ناپسند ہو، یا بیوی ایسی ہو کہ اس کے ساتھ گزارا مشکل ہو، یا گھوڑا ایسا ہو کہ اس پر سفر اس کو ناگوار ہو، تو وہ ان کو چھوڑ دے۔"

اور بعض نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے:

'إِنَّ شُؤْمَ الدَّارِ ضَيِّقُهَا وَسُوءُ جَوَارِهَا، وَشُؤْمَ الْمَرْأَةِ أَنْ لَا تَلِدَ وَشُؤْمَ الْفَرَسِ أَنْ لَا يُغْزَ عَلَيْهِ]'37[

' 'گھر کی نحوست اس کا تنگ ہونا اور پڑوسی کا برا ہونا ہے، عورت کی نحوست اس کا بانجھ پن اور گھوڑے کی نحوست اس پر جہاد کرنے کا موقع نہ ملنا ہے۔"،

بعض آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جیسے حضرت معمر (تابعی) فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کی یہ تفسیر سنی ہے (بظاہر یہی ہے کہ کسی صحابی سے سنی ہو گی)۔

’شُؤْمُ الْمَرْأَةِإِذَا كَانَتْ غَيْرَ وَلُودٍ، وَشُؤْمُ الْفَرَسِ إِذَا لَمْ يُغْزَ عَلَيْهِ وَشُؤْمُ الدَّارِ جَارُ السَّوءِ]©‘38[

’ ’عورت کی نحوست اس کا بانجھ ہونا ہے، گھوڑے کی نحوست اس پر بیٹھ کر جہاد نہ کرنا ہے اور گھر کی نحوست برے پڑوسی کا ہونا ہے۔“

بہر حال مطلقاً عورت یا کسی بھی چیز کی نحوست کا عقیدہ بے بنیاد اور تقدیر پر ایمان کے منافی ہے، اس لیے اس قسم کے تصورات سے بچنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

بیوی کو عار نہ دلائے

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت بد چلن یا مرد بد کردار ہوتا ہے لیکن ایسے جوڑے سے اللہ تعالیٰ اولاد صالح پیدا فرما دیتا ہے، اولاد میں ماں باپ کی وہ خرابیاں نہیں ہوتیں جو شریعت میں بھی ناپسندیدہ ہیں اور لوگوں کی نظروں میں بھی ناقابل قبول ہوتی ہیں۔ ایسے ماں باپ کی کوئی نیک چلن لڑکی اگر کسی شخص کے حبالۂ عقد میں آجائے تو کسی بھی موقع پر اس کی کسی کوتاہی کی وجہ سے اس کو یہ نہ کہے کہ ہاں تو بیٹی تو اسی ماں یا باپ کی ہے جو ایسی ایسی یا ایسا ایسا ہے یا تھی یا تھا۔ اسے عار دلانا کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ناپسند فرمایا اور اسے زمانۂ جاہلیت کی خُو (بدعادت) قرار دیا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص (اپنے غلام) کو برا بھلا کہا اور اسے عار دلائی کہ تیری ماں ایسی تھی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

’يَا أَبَا ذَرٍّ! أَعَيَّرْتَهُ بِأُمِّهِ؟ إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ“

’’اے ابوذر! کیا تو نے اس کو اس کی ماں کی وجہ سے عار دلائی ہے، تیرے اندر تو ابھی تک جاہلیت کی خُو ہے۔‘‘

پھر فرمایا:

’إِخوَانُکُمۡ خَوَلُکُمۡ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحۡتَ أَيۡدِيكُمۡ، فَمَنۡ كَانَ أَخُوهُ تَحۡتَ يَدِهِ فَلۡيُطۡعِمۡهُ مِمَّا يَأۡكُلُ، وَلۡيُلۡبِسۡهُ مِمَّا يَلۡبَسُ، وَلَا تُكَلِّفُوهُمۡ مَا يَغۡلِبُهُمۡ، فَإِنۡ كَلَّفۡتُمُوهُمۡ فَأَعِينُوهُمۡ]‘39[

’’تمھارے بھائی (غلام) تمہارے ماتحت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو تمھارے ماتحت کیا ہے (تم کو ان پر بالادستی عطا کی ہے اور ان کو تمھارے زیر دست کیا ہے) پس جو بھائی (غلام نوکر چاکر) اس کے ماتحت ہو اس کو چاہیے کہ اس کو وہی کچھ کھلائے جو وہ کھاتا ہے، اور اس کو وہی کچھ پہننے کو دے جو وہ خود پہنتا ہے اور ایسا کوئی کام اس کے سپرد نہ کرے جو اس کی طاقت سے بالا ہو، اگر تم ایسا کوئی کام اس کے سپرد کرو تو تم ان کی مدد کرو (ان کے ساتھ مل کر وہ کام کرو۔)‘‘

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے ماتحتوں، زیر دستوں اور غلاموں، نوکروں کو عار دلانا، ان کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہوئے ان کو کھانے پینے میں اپنے ساتھ بٹھانے سے گریز کرنا اور ان پر ان کی طاقت سے زیادہ کاموں کا بوجھ ڈالنا یہ سب ممنوع ہیں تو بیوی تو غلام اور ماتحتوں سے زیادہ شرف و فضل اور عزت و احترام کی مستحق ہے، اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کی اجازت کب ہو سکتی ہے؟

اس لیے حسن معاشرت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ بیوی کو عار نہ دلائی جائے۔ اس کے ماں باپ کیسے بھی ہوں یا کیسے بھی کبھی رہے ہوں، یا وہ خود بھی کبھی ایسی ویسی رہی ہو لیکن توبہ کرکے اس نے اپنی اصلاح کرلی ہو اور اب وہ صحیح معنوں میں ایک صالح اور نیک چلن ہو اور اسی وجہ سے اس نے اسے اپنا رفیق زندگی بنانے کے

لیے پسند کیا ہو تو اس کے بعد اس کو عار دلانے کا کوئی جواز نہیں ہے اور یہ حسن معاشرت کے خلاف ہے کیونکہ اس میں
اس کی دل آزاری کا پہلو ہے جب کہ حسن معاشرت کا تقاضا اس کی دلجوئی و دلداری کرنا ہے نہ کہ دل آزاری۔

بیوی پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب ایک غلام اور ماتحت شخص پر بھی اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا جائز نہیں ہے جب کہ ان کو اپنے گھروں میں رکھنے کا مقصد ہی ان سے اپنی خدمت لینا اور ان سے اپنے اندرونی و بیرونی کام کرانا ہوتا ہے تو بیوی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا کب جائز ہو سکتا ہے۔؟

بلاشبہ خاوند کی خدمت اور گھریلو امور کی انجام دہی عورت کی ذمے داری ہے، لیکن مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس معاملے میں بھی حسن معاشرت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھے اور اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً، خاوند اس کو گھریلو اخراجات کے لیے جو رقم مہیا کرے، وہ ضروریات سے بہت کم ہو، لیکن خاوند اس کو مجبور کرے کہ وہ اسی رقم سے تمام ضروریات پوری کرے، ظاہر بات ہے بعض خاوندوں کا یہ رویہ سراسر تحکم اور تکلیف مالایطاق ہی ہے۔

اسی طرح بعض گھروں میں آنے والی نئی بہو پر ضرورت سے زیادہ کاموں کا بوجھ ڈال دیا جاتا ہے جب کہ گھر میں اس کی جوان نندیں وغیرہ بھی ہوتی ہیں۔ عدل و انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ سب مل جل کر گھریلو امور سرانجام دیں، ساس سسر بھی اس پہلو کو ملحوظ رکھیں، خاوند اگر اس سلسلے میں ماں باپ سے کوئی بات کرتا

ہے تو اس کو زن مرید ہونے کا طعنہ دے کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔
اس بے انصافی کے تین نتیجوں میں سے کوئی
ایک نتیجہ بالعموم ظاہر ہوتا ہے۔
(1) یا تو خاوند اور بیوی دونوں، ماں باپ اور ساس سسر کے احترام میں خاموشی سے اس بے انصافی کو برداشت کرتے رہتے ہیں اور عورت طاقت سے زیادہ بوجھ برداشت کرتی رہتی ہے اور گھر کا نظم میاں بیوی کی خاموشی اور بزرگوں کے احترام کی وجہ سے قائم رہتا ہے۔ ظاہر ہے یہ سکون دبائو کا نتیجہ ہے، حسن معاشرت کا نتیجہ نہیں۔
(2) اگر میاں بیوی اس بے انصافی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو جلد یا بہ دیر یہ صورت حال ماں باپ سے علیحدگی پر منتج ہوتی ہے۔
(3) گھر کی دوسری خواتین (نندیں، ساس وغیرہ)۔ اگر اس بے انصافی پر مصر رہتی اور سارا بوجھ فرماں بردار بیٹے کی بیوی پر ہی ڈالنے کی پالیسی پر گامزن رہتی ہیں تو جلد ہی پیمانۂ صبر لبریز ہو جائے گا اور پھر آئے دن اس پر باہم تھکا فضیحتی ہو گی جس سے میاں بیوی کا سکون بھی برباد ہو گا، گھر کا امن بھی قائم نہیں رہے گا اور ساس کا بے انصافی پر مبنی یہ رویہ لڑکی کے خاندان کو بھی ان سے بدظن کر دے گا اور مخاصمت و عناد کی ایسی فضا قائم ہو جائے گی۔ جو دونوں خاندانوں کو مضطرب رکھے گا۔
بنابریں یہ تینوں ہی صورتیں ظلم و ناانصافی کی ہیں جو حسن معاشرت کے خلاف ہیں۔ یہ ساس بہو کا وہ روایتی کردار ہے جس کی کہانیاں ہمارے معاشرے میں عام ہیں۔ لیکن اہل دین اور خشیت الٰہی رکھنے والوں کو اس قسم کے رویوں سے بچنا چاہیے، ایسا رویہ آخرت ہی برباد کرنے والا نہیں ہے بلکہ دنیا بھی بگاڑ دینے والا ہے۔

مشاورت کا اہتمام کیا جائے

حسن معاشرت کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ہر اہم معاملے میں مرد بیوی سے مشاورت کا
اہتمام کرے، بیوی کو نظر انداز کر کے کوئی فیصلہ نہ کرے۔ یہ حسن معاشرت کے بھی خلاف ہے اور عقل و دانش کے بھی منافی۔ عدم مشاورت سے بھی بعض دفعہ میاں بیوی کے درمیان ایسی تلخیاں اور کشیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو پورے گھر کے سکون کو برباد کر دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر تک کو یہ حکم دیا کہ وہ مسلمانوں سے مشاورت کا اہتمام کریں۔

[وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ] [آل عمرٰن 159]

’ ’اور (دین کے) کام میں ان سے مشورہ کیا کیجئے۔“

اور مسلمانوں کی صفت یہ بھی بیان فرمائی کہ وہ اپنے معاملات باہم مشاورت سے چلاتے ہیں۔

[وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ] [الشوریٰ 38]

” اور ان کے کام باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں‘ ‘

صلح حدیبیہ کے موقعے پر جو معاہدہ لکھا گیا تھا، مسلمان اس کی ظاہری دفعات سے دل گیر تھے اور نبوت کی نگاہِ دوررس میں اس کے جو فوائد تھے، عام مسلمان اس کا اندازہ کرنے سے قاصر تھے۔ بنا بریں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدے کے تحریر کیے جانے کے بعد صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھو! اور اپنے اپنے جانور قربان کر دو (کیونکہ اس سال ہم مکہ جا کر عمرہ نہیں کر سکیں گے) لیکن صحابہ غم سے نڈھال اور دل گرفتہ تھے، اس لیے کوئی بھی نہ اٹھا، حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنی بات تین مرتبہ دہرائی مگر پھر بھی کوئی نہ اٹھا تو آپ اپنی زوجۂ مطہرہ حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور صحابہ کے اس طرز عمل کا ذکر کیا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیا کہ آپ کسی کو کچھ نہ کہیں اور جا کر اپنا جانور ذبح کر دیں اور اپنا سر منڈا لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورے کے مطابق اپنی ہدیٰ کا جانور ذبح کر دیا اور حجام کو بلا کر سر منڈوالیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ نے آپ کے عمل کو دیکھ کر بلا توقف اپنے اپنے جانور بھی ذبح کر دیے اور باہم ایک دوسرے کے سر بھی مونڈ دیے۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تر عظمت کے باوجود جب اپنی اہلیہ محترمہ سے جا کر مشورہ کیا تو انھوں نے جو مشورہ دیا، اس پر عمل کرنے سے ایک نہایت اہم مسئلے کا فوری حل نکل آیا جس پر آپ خود بھی سخت پریشان تھے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کو صرف اپنی عقل و دانش ہی کو حرف آخر نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اپنے رفیق زندگی یعنی بیوی سے بھی ہر اہم معاملے پر مشورہ کرنا اور باہم مل کر سوچ بچار کرنا نہایت بابرکت عمل ہے۔ نہ عورت اپنے طور پر فیصلہ کرے اور نہ مرد ہی ایسا کرے بلکہ دونوں قدم سے قدم ملا کر اور ایک دوسرے کو اپنا ہم نوا بنا کر اور اعتماد میں لے کر فیصلہ کریں۔

جب بچے بچیاں جوان ہو جاتے ہیں تو ان کے رشتوں ناطوں کے سلسلے میں اگر باہم مشاورت اور افہام و تفہیم سے کام نہ لیا جائے تو بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور بعض دفعہ بچوں کے مستقبل بھی تاریک ہو جاتے ہیں، و علی ہذا القیاس، دوسرے معاملات ہیں، سب میں باہم مشاورت باعث برکت بھی ہے اور حسن

معاشرت کا تقاضا بھی، اور گھر کی خوش گوار فضا اور اس کے امن و سکون کو برقرار رکھنے کا ایک بڑا سبب بھی۔

مرد حسن باطنی کے ساتھ، ظاہری زیب وزینت کو بھی اختیار کرے

جس طرح مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ بیوی حسن وجمال کا پیکر ہو یا کم از کم آرائش وزیبائش کا اہتمام کرنے والی ہو۔ اسی طرح عورت کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا خاوند مردانہ جاہ وجلال اور حسن وجمال کا حامل ہو۔ اس لیے مرد کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ عورت کی اس جائز خواہش کا احترام کرے اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ظاہری زیب وزینت اختیار کرنے میں بے اعتنائی نہ برتے۔ جیسے صاف ستھرا رہنا، نظافت وطہارت کا خیال رکھنا، خوشبو وغیرہ کا استعمال اور کنگھی تیل کا اہتمام، وغیرہ، اسی لیے حدیث میں آتا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے گھر تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلا کام کیا کرتے تھے؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "مسواک کرتے تھے۔ (تاکہ منہ سے خوش گوار خوشبو آئے۔) تاہم اس زیب وزینت کے اختیار کرنے میں نہ شریعت سے تجاوز ہو اور نہ کبر وغرور کا اظہار ہو، یہ دونوں باتیں ناپسندیدہ ہیں۔ "

مثلاً، آج کل زیب وزینت کا معیار یہ ہے کہ مرد کا چہرہ سنتِ رسول (داڑھی) سے پاک ہو، انگریزوں کے لباس (ٹائی، پتلون) میں ملبوس ہو اور بیوٹی پارلر میں جا کر آراستہ وپیراستہ ہو۔ ظاہر بات ہے یہ زیب وزینت اللہ کو ناپسند ہے۔

اسی طرح زیب وزینت کے ڈانڈے کبر وغرور سے نہ جا ملیں۔ بلکہ یہ زیب و زینت ظاہری وباطنی حسن وجمال کا ایسا حسین امتزاج ہو جس میں حُسن صورت

بھی ہو اور حُسن سیرت بھی۔ حُسنِ سیرت اور باطنی جمال کے بغیر ظاہری حسن کی حیثیت اس شخص کی طرح ہے جو غبار آلود چہرے پر غازہ پاشی کر لیتا ہے جس سے اس کا چہرہ نکھرنے کے بجائے اور دھندلا جاتا اور کالک زدہ سا ہو جاتا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں ظاہری لباس کو وجہ زینت بتلایا ہے تو وہیں لباس تقوی کی

اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے جس کا تعلق انسان کے باطن سے ہے۔

[يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ][الأعراف26]

" "اے بنی آدم (انسانو)! ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا ہے جو تمہاری شرم والی چیزوں کو بھی چھپائے اور زینت کا باعث بھی ہو، اور لباس تقوی (دل میں خشیت الٰہی) یہ بہت بہتر ہے، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۔"

گویا دل میں عجب، کبر و غرور اور ظاہری حسن کا پندار اور گھمنڈ نہ ہو، بلکہ اللہ کا خوف ہو جو انسان کو بہکنے اور بھٹکنے سے محفوظ رکھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہے:

'لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ'

" "وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو گا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سن کر ایک شخص نے پوچھا:

'إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنَةً'

" "ایک آدمی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو اور اس کی جوتی اچھی ہو (کیا یہ بھی کبر ہے؟۔")

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'إِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، اَلْكِبْرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ'

' 'اللہ تعالیٰ خوب صورت ہے، خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔ کبر (غرور) تو حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔]"40[

یعنی اچھا لباس پہن کر خوب صورتی اختیار کرنا تو اللہ کو پسند ہے کیونکہ وہ خود خوب صورت ہے۔ البتہ اچھا لباس (خلعتِ فاخرہ) پہن کر اس پر اترانا، اکڑنا اور کبر و غرور کا اظہار بایں طور کرنا کہ اس کو حق کی بات بتلائی جائے تو اپنی انانیت میں اس کا انکار کر دے اور اپنے سے کم تر رتبوں کے لوگوں کو حقیر سمجھے، یہ کبر ہے جو اللہ کو ناپسند ہے۔

ایک اور حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'كُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا، اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ، وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَحْقِرُهُ، اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا، وَيُشِيرُ إِلٰى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مِرَارٍ، بِحَسْبِ امْرِءٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ... الحديث]'41[

' 'اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس پر نہ ظلم کرے، نہ اس کو (مدد کے وقت) بے یار و مددگار چھوڑے اور نہ اس کو حقیر سمجھے۔ اور اپنے سینے کی طرف تین مرتبہ اشارہ کر کے فرمایا: تقویٰ یہاں ہے، تقویٰ یہاں ہے، تقویٰ یہاں ہے، یعنی دل (سینے) میں۔ آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔"

ایک اور حدیث میں فرمایا:

'إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى أَجْسَادِكُمْ وَلَا إِلٰى صُوَرِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوبِكُمْ وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ إِلٰى صَدْرِهِ وَفِي رِوَايَةٍ وَأَعْمَالِكُمْ]'42[

' 'اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، وہ تو تمہارے دلوں کو (اور اپنے ہاتھوں سے اپنے سینے کی طرف اشارہ فرمایا) اور تمہارے عملوں کو دیکھتا ہے۔"،

مرد رات کا بیشتر حصہ گھر میں گزارے

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی بابت پہلے گزرا کہ وہ ساری رات قیام کرتے اور دن کو روزہ رکھتے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات آئی تو آپ نے ان سے فرمایا:

’وَلِأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا‘[43]

’’تیرے گھر والوں (بیوی) کا بھی تجھ پر حق ہے۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ قیام اللیل رات کو (اللہ کی عبادت کرنا) بلاشبہ بہت فضیلت والا عمل ہے لیکن رات کو بیوی کے حقوق کو نظر انداز کر کے اگر قیام کیا جائے گا تو یہ پسندیدہ امر نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی مرد راتوں کو اپنا وقت دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں یا اسی طرح کی دیگر سرگرمیوں میں گزارتا ہے اور رات کو دیر سے گھر میں آتا ہے تو یہ بھی بیوی کی حق تلفی ہے اور حسن معاشرت کے بھی منافی ہے۔

حُسنِ معاشرت کا تقاضا ہے کہ مرد سارا دن گھر سے باہر گزارنے کے بعد رات کا وقت بیوی کے پاس گزارے اور اس کی دلداری و دلجوئی کا اہتمام کرے۔ سارے دن کی جدائی کے بعد رات کو بھی عورت کو انتظار کے کرب انگیز لمحات گزارنے پر مجبور کرنا کسی لحاظ سے بھی مستحسن اور پسندیدہ نہیں ہے۔

میاں بیوی کے درمیان راز کی باتیں دوستوں میں بیان نہ کی جائیں

بہت سے نوجوان اپنے دوستوں کی محفل میں تنہائی اور راز کی باتیں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں جو ان کے اور ان کی بیویوں کے درمیان ہوتی ہیں، بالخصوص شب زفاف (شادی کی پہلی رات کی) باتیں۔ یہ شرعاً ناپسندیدہ امر ہے اور اس پر سخت وعید وارد ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'إِنَّ مِنْ أَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللَّهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ، الرَّجُلُ يُفْضِي إِلَى امْرَأَتِهِ وَتُفْضِي إِلَيْهِ ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا، وَفِي رِوَايَةٍ: إِنَّ مِنْ أَعْظَمِ الْأَمَانَةِ أَيْ أَعْظَمِ خِيَانَةِ الْأَمَانَةِ عِنْدَ اللَّهِ' . . .

' 'قیامت کے دن اللہ کے ہاں لوگوں میں سب سے زیادہ بدتر درجے والا (دوسری روایت کے الفاظ ہیں) امانت میں سب سے زیادہ بڑی خیانت کرنے والا، وہ شخص ہوگا جو اپنی بیوی کے پاس جاتا اور وہ اس کے پاس جاتی ہے (دونوں ہم بستری کرتے ہیں) پھر وہ شخص اپنی بیوی کی راز کی باتیں پھیلاتا (دوستوں میں بیان کرتا) ہے۔]"44[

بیوی کے راز افشا کرنے کا مطلب ہے، ہم بستری کے وقت میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ جو پیار محبت کی باتیں کرتے، ایک دوسرے کو جنسی تلذذ پر آمادہ کرنے کے لیے جو حرکتیں کرتے اور اس خصوصی عمل سے جو لذت حاصل کرتے ہیں، ان کیفیات کو بیان کرنا۔ اس کی ممانعت میں کئی حکمتیں ہیں:

(1) یہ بے حیائی کی باتیں ہیں، ان سے بے حیائی کو فروغ ملتا ہے۔

(2) بیوی کے حسن وجمال اور اس کی نازنینانہ ادائوں اور محبوبانہ غمزوں اور عشووں کے بیان کرنے میں خطرہ ہے کہ اس کے دوست، یہ باتیں سن کر اس کے رقیب بن جائیں اور اس کی دلربا بیوی سب کے لیے فتنہ اور آزمائش بن جائے۔

(3) اور اگر بیوی اس کے برعکس ہو، یعنی خوب رو نہ ہو تو اس کی برائیاں یا اس کے بارے میں ناخوشگوار تاثرات یہ حسن معاشرت کے منافی ہے۔ دوستوں میں ان باتوں کے بیان کرنے کی وجہ سے یہ باتیں دونوں خاندانوں میں بلکہ دوستوں کے گھرانوں میں

پھیلیں گی جس کے اثرات اچھے نہیں ہوں گے۔

یہی حکم عورت کے لیے بھی ہے کہ وہ خلوت کی ان باتوں کو اپنی سہیلیوں میں بیان نہ کرے۔

بیوی کو دینی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے

حسن معاشرت کا ایک حصہ یہ ہے کہ جس طرح بیوی کے لیے اپنی طاقت کے مطابق دنیوی آسائشیں اور سہولتیں مہیا کرے، اسی طرح خاوند اس بات کا بھی اہتمام کرے کہ بیوی کی آخرت کی زندگی بھی بہتر ہو۔ اور آخرت کی زندگی کا سنورنا منحصر ہے اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں۔ اور عمل تب ہی ہوگا جب اس کو دینی تعلیمات سے آگاہی اور ان پر عمل کرنے کا جذبہ ہوگا۔

بنابریں مرد کی ذمے داری ہے کہ وہ عورت کی دینی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام کرے اور دین پر عمل کرنے کا جذبہ بھی اس کے اندر پیدا کرے۔ اگر بیوی اس میں کوتاہی کرے تو اس پر سختی کرے اور دین پر عمل کروائے تاکہ اس کی آخرت برباد نہ ہو۔

علاوہ ازیں اس کی دین داری کی وجہ سے اس کی گود میں پلنے والی اولاد بھی دین دار ہوگی، بصورت دیگر اولاد کی بھی بے راہ روی کا شدید خطرہ ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ حکم دیا ہے:

[يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ] [التحریم66]

''اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو بھی اور اپنے گھر والوں (اہل) کو بھی اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔''

اسی حکم میں نماز کی پابندی بھی شامل ہے، یعنی بیوی بچے اگر نماز میں سستی کرتے ہوں تو

انھیں سختی سے نماز پڑھنے کی تلقین کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا:

[وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا] [طٰہٰ132]

’ ’اپنے اہل خانہ کو نماز کا حکم دیں اور اس پر مضبوطی سے قائم رہیں۔“

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہے:

’مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِينَ وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ]‘45[

’ ’تم اپنی اولاد کو، جب کہ وہ سات سال کی ہو جائے، نماز کا حکم دو اور جب وہ دس سال کی ہو جائے (اور وہ نماز میں سستی کرے) تو اس پر اس کی سرزنش کرو، اور (اس عمر میں) ان کے بستر ایک دوسرے سے الگ کر دو۔“،

گھر سے باہر جانے کی اجازت دے، مگر…

حسن معاشرت میں یہ بھی شامل ہے کہ خاوند بیوی کو گھر سے حسب ضرورت باہر نکلنے کی اجازت دے، اس میں بلاوجہ قدغنیں نہ لگائے۔ جیسے بعض لوگ بیوی کو اس کے رشتے داروں کے پاس جانے سے روکتے ہیں، بعض گھر سے ہی نہیں نکلنے دیتے، بعض مسجدوں میں جانے سے روکتے ہیں۔ یہ سب باتیں حسن معاشرت کے منافی ہیں۔ جب شریعت نے یہ پابندیاں عائد نہیں کی ہیں تو کسی اور کو اس کا حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

البتہ یہ ضروری ہے کہ عورت بلاوجہ گھر سے باہر نہ گھومتی پھرے اور اگر کسی ضرورت کی وجہ سے باہر جانا پڑے تو شریعت کے حکم کے مطابق سادگی اور پردے سے باہر جائے۔ بعض عورتیں پردے اور سادگی کی اہمیت کو نہیں سمجھتیں اور بے پردہ بلکہ نیم عریاں ہو کر گھر

سے نکلتی ہیں۔ مرد کی ذمے داری ہے کہ ایسی بے پردہ اور فیشن ایبل عورت کو سختی سے پردے کا پابند بنائے اور اس کو اس حدیث کا مصداق بننے سے روکے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی عورتوں کو ”لباس پہننے کے باوجود عریاں وقرار

دیااوران کی بابت جہنم کی وعید بیان فرمائی۔ یہ حدیث مکمل الفاظ میں پہلے گزر چکی ہے۔

گھر کے اندر بھی عورت کی حفاظت کرے

اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں ایسے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ دے جن سے عورت کی عزت کو خطرہ ہو اور نہ وہ خود ایسے دوستوں کو گھر میں لا کر گھنٹوں بٹھائے رکھے جس سے اس قسم کے خطرات پیدا ہوں۔ اسی طرح قریبی رشتے داروں کے نوجوان بچوں کو بلا محابہ گھر میں آنے جانے کی اجازت نہ دی جائے، حتیٰ کہ شریعت نے دیور اور جیٹھ تک سے پردہ کرنے کی تاکید کی ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'إِيَّاكُمْ وَالدُّخُولَ عَلَى النِّسَاءِ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! أَفَرَأَيْتَ الْحَمْوَ؟ قَالَ: اَلْحَمْوُ الْمَوْتُ' [46]

' 'عورتوں کے پاس جانے سے اجتناب کرو۔ ایک انصاری نے پوچھا: خاوند کے قریبی رشتے دار (دیور، جیٹھ وغیرہ) کے بارے میں وضاحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: خاوند کا قریبی رشتے دار (دیور، جیٹھ وغیرہ) تو موت ہیں۔"

' 'حمو" عربی میں خاوند کے نہایت قریبی رشتے دار کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس لیے اکثر لوگ اس کا ترجمہ دیور، جیٹھ کر دیتے ہیں۔ بلاشبہ قریبی رشتے داروں میں سب سے پہلے خاوند کے حقیقی بھائی ہی آتے ہیں لیکن اس لفظ میں وسعت ہے۔ اس میں حقیقی

بھائیوں کے علاوہ اس کے چچازاد، ماموں زاد، پھوپی زاد، اور خواہر زاد (بھانجے) سب آجاتے ہیں جن سب کے لیے آج کل کزن کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ شریعت اسلامیہ میں ایک عورت کے لیے یہ سب غیر محرم ہیں جن سے پردہ کرنے کا حکم ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں ان سے پردے کا رواج نہیں ہے، سوائے چند

گھرانوں کے بیشتر گھروں میں اس پر عمل نہیں کیا جاتا، جس کی وجہ سے بعض دفعہ عورت فتنے کا شکار ہو جاتی ہے اور ایسا کام کر بیٹھتی ہے جس کی سزا رجم (سنگساری) ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیور، جیٹھ اور کزنوں کو موت سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس لیے مرد کی ذمے داری ہے کہ گھر کے اندر گھر میں ساتھ رہنے والے بھائیوں اور گھر میں آنے جانے والے کزنوں پر نظر رکھے اور جہاں تک ہوسکے پردے کا اہتمام کرے تاکہ کسی قسم کی ناخوشگوار صورت حال سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

اسی طرح گھروں میں ایسے لوگوں کو بھی داخلے کی اجازت نہ دی جائے جو بے حیائی کی ترغیب دینے والے ہوں۔ جیسے مخنّث (ہیجڑے) وغیرہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ اپنی اہلیہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر تھے۔ گھر میں ایک مخنّث بھی تھا، وہ حضرت ام سلمہ کے بھائی عبد اللہ بن ابی امیہ سے کہنے لگا: اگر کل کو اللہ نے تمہارے لیے طائف کو فتح کروادیا تو میں تمہیں وہاں رہائش پذیر غیلان کی بیٹی بتلاؤں گا جو موٹی تازی ہے، چلتے وقت اس کے جسم میں آگے پیچھے اتنے اتنے بَل پڑتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے یہ الفاظ سنے تو فرمایا:

'لَا يَدْخُلَنَّ هٰذَا عَلَيْكُمْ'

صحيح البخاري، حديث: 5235

' 'یہ تمہارے گھروں میں داخل نہ ہوں۔"

عورت کی خدمات کا اعترف کرے

حسن معاشرت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مرد عورت کی ان خدمات کا اعتراف کرے جو ایک عورت گھر کے اندر رہ کر شب وروز سر انجام دیتی ہے۔ جیسے:

گھر کی صفائی

کھانا پکانا اور انواع و اقسام کی ہانڈیاں تیار کرنا۔

افرادِ خانہ کے کپڑے دھونا۔

بچوں کی خبر گیری کرنا، ان کی خوراک وغیرہ کا خیال رکھنا۔

آئے گئے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنا۔

خاوند کی خدمت اور اس کی خواہش پوری کرنا۔

سلیقہ مندی اور سگھڑپن سے گھر کا انتظام چلانا۔

رشتے داریوں اور ان کے تقاضوں کو نبھانا۔

شادی شدہ بیٹیوں اور بیٹوں کے بچوں کا خیال رکھنا۔

مستقبل کی منصوبہ بندی اور اس کو اپنے لیے اور پورے کنبے کے لیے زیادہ سے زیادہ روشن بنانے کی سعیٔ پیہم اور جہدِ مسلسل کرنا، وغیرہ وغیرہ۔

ایک کتاب کے فاضل مؤلف کی صراحت

ایک کتاب کے فاضل مؤلف نے عورت کی خدمات کا بڑے مؤثر انداز میں تذکرہ کیا ہے، اس کی افادیت کے پیش نظر ہم اپنے قارئین کی خدمت میں اسے پیش کرتے ہیں۔

’’بعض نادان لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت کا خانگی اور گھریلو کام آسان ہوتا ہے۔ لہٰذا دن بھر صرف انہی کاموں کے لیے فارغ رہنا ایسا ضروری نہیں ہے۔ یہ گمان جہالت پر مبنی ہے اس لیے کہ بچوں کی تربیت جیسی اہم ذمے داری جب تک عورت کے کاندھے پر ہوتی ہے اس کے لیے فرصت ضروری ہے تاکہ اپنی ذمے داری کو حدیث میں بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق نباہنے کے لیے اسے کچھ پڑھنے اور بکثرت مشاہدے کا موقع ملے۔ مزید برآں اسے اپنا ذہن یکسو اور دل کو مطمئن رکھنے کے

لیے بھی وقت درکار ہوتا ہے تا کہ ایسے زوردار اثر احساس اور تیز جذبے سے محفوظ ہو جس کا راست اثر پیٹ کے اندر یا دودھ پینے والے بچے پر پڑتا ہے اور بد ترین اندیشہ سامنے آتا ہے۔
علم نفسیات کے تجربے اور مشاہدے سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ڈاکٹر محمد حسین لکھتے ہیں:

''یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ عورت کا پہلا کام یعنی بچہ پیدا کرنا اور نسل انسانی کی حفاظت کرنا ایسا عمل ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور انجام نہیں دے سکتا۔ مرد کے جسمانی اعضاء کی بناوٹ پیٹ میں بچہ پالنے یا دودھ پلانے کے لائق ہر گز نہیں ہوتی۔ اب اگر عورت کو شدت سے کام میں جوڑ دیا جائے تو ظاہر ہے اس کے دل و دماغ اور اعصاب پر اس کا اچھا اثر مرتب نہیں ہوگا۔
نیز یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے گہرے اثرات عورت کے دل سے ہو کر حمل کی حالت میں رہنے والے پیٹ کے بچے پر براہ راست پڑتے ہیں اسی طرح شیر خوار بچہ بھی ان اثرات سے کسی طرح خود کو نہیں بچا سکتا۔ موروثی اثرات کے بعض ماہرین یہاں تک کہتے ہیں کہ ماں اور باپ پر جو حالت یا کیفیت جنسی ملاپ یا (ماں پر) حمل کے دوران طاری ہوتی ہے اس کا تمام تر اثر بچے کی عادت
اور طبیعت پر پڑتا ہے جن عورتوں کو حمل کی مشقت اٹھانی پڑتی ہے، پیٹ کے اندر بچے کی حفاظت اور پیدائش کے بعد ان کی تربیت اور نگہداشت جن کے ذمہ عائد ہوتی ہے، ایسی تمام خواتین کے لیے ضروری ہے کہ اعصابی ہیجان سے دور رہیں اور کوئی مشقت کا ایسا کام نہ کریں جس سے عضلات اور دماغ سخت تکان کا شکار ہو جائے۔ ورنہ اس کے اثرات زیر پرورش پیٹ کے بچے یا شیر خوار پر گہرے اور بد ترین پڑیں گے اور تا دیر باقی رہیں گے۔ ظاہر ہے اس ذمہ داری کو سنبھالنا بھی اہم فریضہ اور جانگسل مشغلہ ہے جس میں نسل انسانی کی بقا افزائش اور ترقی مضمر ہے۔ اس مرحلہ سے

عہدہ بر آ ہونے کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ اہلیہ اپنے بچوں پر کامل توجہ صرف کرنے کے لیے پوری طرح فرصت سے رہے، اپنے جسم، عقل اور اپنی عادات واطوار کو اس طرح قابو میں رکھے کہ تندہی سے ان بچوں میں اعلیٰ تعلیم اور اخلاق اور نیک کردار کا بیج بو سکے اور بری عادت سے انھیں بچا سکے۔ اور یہ کام ایک دوبار حکم دینے یا منع کرنے سے نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے مسلسل نگرانی کڑی توجہ اور پوری دیکھ بھال ضروری ہے تاکہ بچوں کے اندر یہ صلاحیتیں راسخ ہو جائیں۔

بچوں کو کسی غلط کام پر پے در پے ٹوکنا اور مسلسل اس کے لیے بیدار ہونا بھی طبیعتوں میں غلط چیز راسخ ہونے سے حفاظت کا سبب بنتا ہے۔ یہ نگرانی جس سے اگر غفلت نہ برتی گئی، صبر اور ثابت قدمی سے اس پر عمل کیا گیا اور کسی قسم کی اکتاہٹ روا نہ رکھی گئی تو اس میں شک نہیں کہ بچوں اور بچیوں میں غلط افکار جڑ پکڑنے سے پہلے کامل طریقہ سے ان کی بیخ کنی ہو گی اور ان کا علاج مشکل نہ ہوگا۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ بچہ صرف حمل یا شیر خوارگی کے دوران ہی اپنی ماں کے اثرات کو قبول کرتا ہے اور اس سے ربط قائم رکھتا ہے، تو ظاہر ہے یہ نظریہ انسان کو حیوان کی صفت میں کھڑا کر دینے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ یہ انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ غذائی پرورش کے ذریعہ ہی نہیں بلکہ اخلاقی اور ذہنی نگہداشت اور پرورش کے ذریعہ بھی اپنے اوصاف کو بچے کے اندر منتقل کرتا ہے۔ جب کہ حیوان اس جوہر سے یکسر خالی ہوتا ہے۔ انسانی ترقی اور حیوانوں سے اس کے افضل ہونے کا یہ بھی ایک سبب ہے۔ اس طریقہ سے نئی نسلیں اپنی پیش رو نسلوں سے تجربے حاصل کرتی ہیں علم و آگہی کا سبق سیکھتی ہیں جس سے وہ اپنا فرض کما حقہ انجام دیتے ہیں۔ اور تجربے کرنے میں جو وقت اور محنت صرف ہوتی ہے انھیں اس سے نجات مل جاتی ہے۔

اور اگر کسی عورت نے خود ان کاموں کو انجام دینے کی بجائے اپنے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کے لیے اپنے نوکروں اور خادموں پر اعتماد کیا، تو ان کی ترقی رک جائے گی۔ کیونکہ ماں جس قدر توجہ اور سرگرمی سے اپنے بچوں کے لیے وقت صرف کر سکتی ہے، جتنے اخلاص اور دردمندی سے وہ کام کر سکتی ہے، اس کا سواں حصہ بھی اس کے علاوہ کسی اور میں نہیں پایا جا سکتا کیونکہ ماں کے اخلاص اور پرورش کی شدید خواہش کے پیچھے اس کے ممتا بھرے جذبات ہوتے ہیں اور اس معاملہ میں نوکروں اور ماتحتوں پر اعتماد کرنے سے تربیت اور پرورش کا وہ پہلا معیار قطعاً برقرار نہیں رہ سکتا۔ خواہ نوکروں سے کتنی ہی اعلیٰ درجے کی خدمت لی جائے۔ خواہ ترقی اور کمال کے لیے بڑے سے بڑا وسیلہ اختیار کیا جائے اور ان خیانتوں اور سستی اور غفلت سے صرف نظر کیا جائے، جس کا نوکروں کی طرف سے روزمرہ کی زندگی میں بارہا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

اور آج جو دفاتر میں کام کرنے والی مائوں نے اپنا دودھ پلانے کی بجائے مصنوعی طریقہ استعمال میں لانا شروع کر رکھا ہے ہماری نظر میں یہ امانت میں خیانت ،حدود سے تجاوز اور سنت الٰہیہ کو بگاڑ دینے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے عورت کو چھاتی اس لیے نہیں دی کہ نائٹ کلبوں میں اس کا مظاہرہ کیا جائے اور سڑکوں اور شاہراہوں پر اپنے حسن وجمال کی نمائش کی جائے۔ بلکہ اس کی تخلیق کا اصل مقصد یہی شیر خوارگی ہے پھر شیر خوارگی کا یہ عمل صرف ایک عضو کا استعمال نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے شفقت مادری اور مضبوط عہد وپیمان کا رشتہ ہوتا ہے اور آج شیر خوارگی کے ان مصنوعی طریقوں کو دیکھ کر یہ اندیشہ ہوتا محسوس ہے کہ خدا نخواستہ مستقبل میں ایسے طریقے نہ ایجاد کر لیے جائیں جن میں مرد کے نطفہ کو ماں کے رحم سے ہٹا کر کہیں اور اس کی پرورش کی جائے تاکہ عورت کو حمل کی مشقت اور خوبصورتی کے زائل ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔

اس صدی کے آغاز میں اٹھنے والی تعلیم نسواں کی تحریک ابتدا میں بکثرت اس بات کا پروپیگنڈہ کرتی تھی کہ بچوں کی بہتر تعلیم وتربیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ عورت خود بھی تعلیم وتربیت یافتہ ہو۔ لیکن جب عورت زیور تعلیم سے آراستہ ہوئی تو یہ تحریک اپنا بچھلا پروپیگنڈہ خود بھول گئی یا بھلادی گئی۔ اور اب وہ یہ کہنے لگے کہ عورت مرد کے شانہ بشانہ مردوں کی طرح خود بھی کام کرے۔ ظاہر ہے ان کا یہ عمل ان کے پچھلے پروپیگنڈے کے اندر موجود کھوٹ کی غمازی کرتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اس پروپیگنڈے اور مشن کے پیچھے کون سے اغراض و مقاصد کارفرما تھے جو ان کے قول و فعل کے تضاد کا باعث بنے۔

علاوہ ازیں ہم چاہیں تو عورتوں اور خود اپنے آپ کے دشمن ان لوگوں کو جنھیں اخبارات اور رسالے عورتوں کے نام نہاد حامی اور معاون لکھتے آرہے ہیں یہ کہہ سکتے ہیں کہ دیکھو! عورت محنت کی عادی نہیں نہ ایسے تمام کاموں کو وہ انجام دے سکتی ہے جنھیں مرد کرنے کی سکت رکھتا ہے۔ کیونکہ تکوینی طور پر عورت مہینہ میں کم وبیش ایک ہفتہ حیض سے ہوتی ہے۔ یہ حالت قریب قریب مرض کی حالت ہے۔ جس کے تحت عورت روزمرہ کے بہت سارے کام حسب معمول انجام نہیں دے سکتی۔ اس کے بعد جب اسے حمل ٹھہرتا ہے تو قرار حمل کے ابتدائی دنوں میں اسے کافی تکالیف اور متعدد بیماریاں آگھیرتی ہیں۔ حمل کے آخری دنوں میں اس کی حالت کبھی ایسی ہوجاتی ہے جیسے اس کا بدن ٹوٹ کر شل ہوگیا ہو۔ پھر ایک مزدور عورت اگر غیر شادی شدہ ہے تو اس کا المیہ یہ ہے کہ اسے مناسب شوہر کی تلاش ہوتی ہے، وہ یہ کوشش کرتی ہے کہ ایسی ہر جگہ سے صاف بچ کر نکل جائے، جہاں اس کی نگاہیں خیرہ اور نظریں چکاچوند ہوتی ہوں۔ اور بچ کر یہ نکل جانا کبھی اس کے لیے نئے شوہر کی تلاش سے زیادہ خطرناک اور مشکل ہوجاتا ہے۔

عورت کے ان دوست نما دشمنوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ عورت کا گھر بیٹھے رہنا اس کے حقوق کو تلف کرنے اس کی شخصیت کو ختم کرنے اور اس کے وجود کو تہس نہس کر دینے کے برابر ہے۔ حالانکہ جیسے زنگی کو الٹے کافور کہا جاتا تھا اسی کے مصداق یہ بھی ہوگا کہ جو محفوظ ہو جس کی خدمت کی جائے اور جس کی ایک ایک ضرورت پوری کی جائے ایسی ذات کو آزادئ نسواں جیسی کتابوں کے مصنف کی طرح ہم قیدی اور نظر بند کا نام دینے لگیں۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ایک عورت پردے کے پیچھے رہ کر بھی باعزت، شان و شوکت والی اور اپنے شوہر پر حکومت کرنے والی ہوتی ہے۔ اسے کسی دن یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس کے حقوق پامال کیے گئے ہیں یا وہ مظلوم و مجبور ہے، یا قیدی اور نظر بند ہے یا اس کی عزت نفس داغدار اور شخصیت مجروح ہو چکی ہے۔ بلکہ اس قسم کی نفرت کا مظاہرہ آئے دن انھی اہل قلم لوگوں کی تحریروں سے ہوتا ہے جو نام نہاد "حقوق نسواں" کا بینر لگا کر نکل پڑے ہیں۔ اس ذہنیت کا شکار صرف مرد ہیں عورتیں ان کے ساتھ قطعی شریک نہیں ہیں۔ اور ان کا مقصد مرد و زن دونوں کی زندگی بگاڑنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر زندگی تو درحقیقت سکون و اطمینان کا نام ہے جس میں لوگ اپنے لیے برکت اور ثابت قدمی کی راہیں تلاش کر سکیں۔ جب کہ اس نام نہاد تحریک کی پیدا کردہ

عورتوں مردوں کے اندر اس یورش اور بغاوت کی غرض صرف یہ ہے کہ ان کے اندر سکون اور چین کے بجائے کشمکش، اضطراب اور بے چینی پیدا کی جائے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہر دو کے اندر محبت اور رأفت و رحمت پیدا ہو، تاکہ کائنات کی آبادکاری اور نسل انسانی کی حفاظت اور بقا کا مرحلہ آسان ہو۔

صحت مند سماج کی بنیاد ہی ہمیشہ باہم میل محبت، رحم دلی اور سچائی پر مبنی ہوتی ہے۔ تاکہ سماج کا ہر فرد خوشی خوشی اپنا فرض منصبی انجام دے سکے۔ اسے کسی اکتاہٹ

اور بے چینی کا احساس نہ ہو۔ سماج کی حالت ایک جسم کی ہوتی ہے جس کا ہر عضو اپنا کام کرنے اور اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ اگر ایک عضو بھی اپنے فرض منصبی کی ادائیگی سے رک جاتا ہے تو پورا نظام بگڑ کر رہ جاتا ہے۔ یہ اللہ کی بے عیب اور بلند ذات بابرکات ہے جس نے ہر چیز کو مناسب طریقے سے پیدا فرمایا، پھر اسے راستہ پر لگا دیا۔ اسی نے ایک ایک فرد کو اور کائنات کے ذرے ذرے کو خواہ وہ حیوانات و نباتات یا جمادات ہوں، یا کوئی اور ہوں، غرض سب کو خاص کاموں کے لیے پیدا کر رکھا ہے۔ ان کے اندر مناسب طبیعتیں بنائی ہیں اور انھی کاموں کا انھیں خوگر بنا ڈالا ہے۔ ہماری موجودہ اور نئی سے نئی زندگی اپنے ہر میدان میں بس اسی شاہراہ پر گھومتی ہے علم و حکمت کا صیغہ ہو، یا صنعت و حرفت کا کل پرزہ ہو۔ آج ہر پہیہ بڑی باریکی، نزاکت اور صفائی کے ساتھ اسی ڈگر پر گھوم رہا ہے جہاں اسے جوڑ دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ترقی و تربیت کے جدید اصول اس کے لیے کوشاں ہیں کہ تحقیق و جستجو کے بعد بچوں اور بچیوں کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے، تاکہ ہر کوئی اپنے تکوینی فرائض اور مخصوص ذمہ داریوں کو انجام دے سکے۔ جب دیگر عناصر کے لیے اس قسم کی تخصیص اور مناسب کارکردگی کی کوشش کی جاتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ مردوں عورتوں کے لیے اس کے مخالف کوشش کی جائے اور ان کے تکوینی کاموں سے انہیں علیحدہ رکھا جائے۔

سچ پوچھیے تو ایک مرد جو گھر کے باہر کام کرتا ہے اور محنت و مشقت کے بعد تھک کر چور ہو جاتا ہے، اسے ایسی بیوی کی ضرورت ہوتی ہے جو آراستہ و پیراستہ ہو، خوشبو میں بسی ہوئی ہو، آسودہ حال اور فارغ البال ہو، جس سے مرد سکون حاصل کرے اس کی قربت سے اس کی تھکن کافور ہو، پژمردگی اور اس کی ایک ایک پریشانی کا ازالہ ہو۔ لوگوں کے ساتھ مصروف رہ کر تنگی اور شکر رنجی جو طبیعت میں بس جائے اور جس اکتاہٹ کا وہ شکار ہوا اس سب کا خاتمہ ہو۔ اس کے بجائے اگر عورت نے

محنت مشقت کے میدان میں قدم رکھا تو شوہر اور بال بچوں کی رعایت وہ بھلا کیسے کرے گی اس لیے کہ کام کے بعد وہ بھی تھک کر چور لوٹے گی جیسے ابھی ابھی مرد لوٹا ہے۔
اب تھکا ہوا تھکے ہوئے سے کس طرح تسلی پا سکتا ہے؟ ان میں سے کس کا دل گردہ ہے جو بچوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور دل لگی کرے، ان کی تربیت اور انہیں خوش رکھنے کے پیّہ مارنے والے کام کو با آسانی انجام دے سکے۔ اور اگر خدانخواستہ مرد و زن نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا تو ان کی زندگی کا بس اللہ ہی نگہبان ہے۔ اس صورت میں ان کی زندگی اذیت و تکلیف اور بد بختی کا دوسرا نام ہو گی، اور پھر سماج کے یہ افراد خواہ مرد، عورت ہوں یا جوان اور بچے ہوں، ان کی حیثیت زندگی کی مشینری میں ان بے جان کل پرزوں کی سی ہو گی جن کی قسمت میں سکون اور ٹھہراؤ نہیں۔ ان کا کام بس چلتے رہنا اور گھستے رہنا ہے۔
ہر بصیرت اور ادنیٰ شعور رکھنے والا اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے کہ اس پہلو سے آج امریکن اور یورپین سماج پر ذلت اور ناکامی کے آثار چھائے ہوئے ہیں اور ابھی تو یہ آثار اور بھی گہرے ہوں گے اس لیے کہ تمام خرابیاں ابھی جڑ تک نہیں پہنچیں۔ بہر کیف یورپ کی موجودہ ذلت کی ماری نئی پود کا تعلق ایسے ماں باپ سے ہے، جو حیران و پریشان اور گم کردہ راہ ہیں جن کے اعصاب ٹوٹ چکے ہیں، جن کے
افکار پراگندہ اور جن کے دل سخت بے چینی کا شکار ہیں اور گراوٹ کا یہ اونچا تناسب... جس کے کل اعداد و شمار کو مغربی ماہرین نے فراہم کیا ہے اس کے اندر بے راہ روی اور کجی اپنے پورے رنگ اور پوری نوعیت کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے یہ مظاہر اور آثار اس تجربہ کے آئینہ دار ہیں جو یورپ نے عورت کے اوپر اب تک کئے ہیں۔ اس لیے کہ یہ نئی نسل تمام تر انھی مزدور اور ملازم پیشہ خواتین کی اولاد ہیں، جنھوں نے ماں کے پیٹ سے مشقت اور کام کے دباؤ کو محسوس کیا ہے۔ اور جب انھوں نے جنم لیا تو یہ ان کی سستی، غفلت اور بے توجہی کا شکار ہوئے۔ اس تجربے کے ناکام ہونے کے بعد

کیا پھر کوئی کسی قسم کے تجربے کی جرأت کر سکتا ہے؟ کیا لوگ اب بھی غور و فکر نہیں کریں گے؟

عورتوں کے ان نام نہاد حمایتیوں کے پاس ان کے گمان کے مطابق جو دلیل اور ثبوت ہیں جن کی بنیادیں تمام تر مغالطے پر مبنی ہیں۔ ان کا سب سے بڑا مغالطہ یہ ہے جو وہ سمجھتے ہیں کہ عورت کے گھر میں رہنے سے تقریباً آدھا سماج معطل اور بیکار ہو کر رہ جائے گا۔ گویا ان کے کہنے کا منشا یہ ہے کہ عورت کے لیے گھر میں کوئی کام نہیں ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عورتوں کی گھریلو ذمہ داری، شوہر کی نگہداشت اور خدمت، بال بچوں کی تربیت اور پرورش اور ان کی طرح طرح کی ضروریات کی تکمیل بذات خود اتنی اہم ہوتی ہے جو عورتوں کا پورا وقت لے لیتی ہے بشرطیکہ عورت کما حقہ اس فریضہ کو انجام دے۔ ورنہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ فرائض کی تکمیل کے لیے پھیلا ہوا وقت بھی تنگ پڑ جاتا ہے۔ ہمارے اس دعوے پر مسکت دلیل جو مخالف کو تقریباً خاموش کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ کام کرنے والی مزدور خواتین ہمیشہ یہ عذر پیش کرتی ہیں کہ جو کام وہ نہیں کر سکتیں ان کی تلافی کے لیے کچھ مرد یا عورت ملازم رکھ لیے جائیں۔ ظاہر ہے اس صورت میں حکومت کی آمدنی میں کون سی ایسی کمائی

یا اضافہ ہو سکتا ہے کہ عورت گھر کے باہر کام کے لیے نکلے۔ اور اس کے پیچھے پیچھے ایک یا دو آدمی ایسے ہوں جنھیں وہ کام سے الگ کیے رہے۔ کیا اس کو اقتصادیات کی اصطلاح میں نفع بخش آدمی کہا جا سکتا ہے اور کیا یہ خود خرابی اور خلل کا پیش خیمہ نہیں ہے کہ عورت گھر کے باہر مردوں کا کام کرے اور کام کرنے والے لوگوں میں سے ایک یا دو آدمی کم ہو کر گھر میں اس عورت کے چھوڑے ہوئے کاموں کو انجام دیں۔ اور اس طرح باضابطہ اور بے ضابطہ ایسے بیکار لوگ لسٹ میں باقی رہیں جن کے

نقصان کا کوئی اثر منافع یا خسارے کے بجٹ میں کہیں نظر نہ آئے۔ اور اگر اس کو درست تسلیم کیا گیا کہ سماج کے نصف بے کار مزدوروں کو کام ملے اس لیے عورت کو کام میں لگانا چاہیے۔ تو اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ سماج کے جملہ مزدوروں کو کام سے ہٹا دیا جائے تا کہ ایک عورت کو عوامی کام دیا جا سکے۔] "48[

[1] صحیح بخاری کتاب النکاح، باب الوصاۃ بالنساء، حدیث نمبر:5186

[2]جامع الترمذي، حدیث:1163

[3] صحیح البخاري، حدیث:4913

سنن أبي داود: کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المراۃ، حدیث:2142، وشرح السنہ:(9/160] (4[

[5] صحیح مسلم، حدیث:995

[6] صحیح مسلم، حدیث:994

[7] صحیح مسلم، حدیث:1002

[8] صحیح البخاری: کتاب اللباس، باب قول اللہ تعالیٰ: قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ۔

[9]تفسیر احسن البیان، مذکورہ آیت۔

[10]سنن أبي داود: کتاب الأدب، باب في اللعب بالبنات حدیث:4932

[11] صحیح البخاري: أبواب العیدین، باب الحراب والدرق یوم العید، حدیث:949

[12] صحیح البخاري، حدیث:5236,950,454

[13] صحیح البخاري، حدیث:5189

[14] صحیح البخاري، حدیث:6149

[15]البقرۃ227، 2:226

[16]تفسیر احسن البیان، طبع دارالسلام،لاہور، بحوالہ تفسیر ابن کثیر

[17]سنن أبي داود، حدیث:2124

[18]سنن أبي داود، حدیث:2134

[19]صحیح البخاري، حدیث:676

[20]فتح الباري:2/212,211، طبع دارالسلام

[21]سنن أبي داود، حدیث:2513

[22]صحیح البخاري، حدیث:5199

[23]صحیح بخاری کتاب (الأدب، باب أحق الناس بحسن الصحبۃ، حدیث نمبر5971۔

[24]مسند أحمد:6/322

[25]تفسیر احسن البیان

[26]صحیح مسلم، حدیث:1218

[27]سنن أبي داود،، حدیث:2147

[28]سنن أبي داود، حدیث:2146

[29]صحیح البخاري، حدیث:5204

[30]صحیح البخاری، حدیث:5094,5093

[31]

[32]سنن أبي داود، حدیث:3924

[33]سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ:72?/1، رقم الحدیث:442

[34]شرح معانی الآثار، بحوالہ الصحیحہ للالبانی:728/2، رقم الحدیث:993۔

[35]موارد الظمآن، النکاح، حدیث:1232، الصحیحۃ:509/1، رقم الحدیث:282

[36] فتح الباري، الجهاد، 6/77

[37] حوالۂ مذکور

[38] فتح الباری: 6/77، مصنف عبد الرزاق: 10/411، رقم الحدیث: 19527

[39] صحیح البخاري، حدیث: 30، و صحیح مسلم، حدیث: 1661

[40] صحیح مسلم، حدیث: 91

[41] صحیح مسلم، حدیث: 2564

[42] صحیح مسلم، حدیث: 2564

[43] السنن الکبریٰ للبیهقی: 16:3

[44] صحیح مسلم، حدیث: 1437

[45] سنن أبي داود، حدیث: 495

[46] صحیح البخاري، حدیث: 5232

[47] صحیح البخاري، حدیث: 5235

[48] ہمارے قلعوں کو درپیش اندرونی خطرات ، ص: 147/153۔ بحوالہ تحفۃ العروس، ص: 303-310

## (12) شعائرِ دین کا مذاق ایک سنگین جرم اور ہمارےمعاشرے میں اس کی مروّجہ صورتیں!

الشیخ خالد حسین گورایہ حفظہ اللہ

خالد حسین گورایہ] 1[

طنز و مزاح لطافت و ظرافت انسانی مزاج کا خاصہ ہے۔ ایک حد تک شریعتِ مطہّرہ نے اس کی اجازت بھی دی ہے۔ لیکن جب یہ چیز مقدّساتِ اسلام اور شعائرِ دین تک پہنچ جائے تو خطرناک صورت حال اختیار کر لیتی ہے۔ اور بسا اوقات انسان ایمان جیسی عظیم دولت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے

۔

دین یا دین کے کسی شعیرہ سے مذاق بہت بڑا گناہ، اللہ تعالیٰ کی حدود کی پامالی، اور کفر کی وادیوں میں سے ایک وادی ہے جس میں جاہل، ہیچ اور لاعلم لوگ گرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح کیا ہے کہ یہ کفار اور منافقین کا عمل ہے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے

يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَن تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُم بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِئُوا إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ ﴿٦٤﴾ وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ﴿٦٥﴾ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ إِن نَّعْفُ عَن طَائِفَةٍ مِّنكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٦٦﴾

سورہ التوبہ آیت نمبر 64تا66

ترجمہ: ”منافقوں کو ہر وقت اس بات کا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں مسلمانوں پر کوئی سورت نہ اترے جو ان کے دلوں کی باتیں انہیں بتلا دے۔ کہہ دیجئے کہ مذاق اڑاتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ اسے ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم ڈر دبک رہے ہو۔ اگر آپ ان سے

پوچھیں تو صاف کہہ دیں گے کہ ہم تو یونہی آپس میں ہنس بول رہے تھے۔ کہہ دیجئے کہ اللہ، اس کی آیتیں اور اس کا رسول ہی تمہارے ہنسی مذاق کے لئے رہ گئے ہیں۔ تم بہانے نہ بناؤ یقیناً تم اپنے ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے اگر ہم تم میں سے کچھ لوگوں سے درگزر بھی کر لیں تو کچھ لوگوں کو ان کے جرم کی سنگین سزا بھی دیں گے"۔

مذکورہ بالا آیت کا سبب نزول ملاحظہ فرمائیں:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "غزوہ تبوک میں ایک شخص نے ایک مجلس میں مذاق اڑاتے ہوئے کہا: "ہم نے اپنے ان قاریوں (اشارہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تھا) سے بڑھ کر پیٹ کا پجاری، زبان کا جھوٹا اور لڑائی کے میدان میں بزدل اور ڈرپوک نہیں دیکھا"

اس مجلس کے ایک دوسرے شخص نے کہا: "تو جھوٹا ہے، منافق ہے، میں اس کی اطلاع نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور دوں گا" جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو اس بارے میں قرآنِ حکیم کی مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ: "میں نے اس منافق کو دیکھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کا پالان پکڑا ہوا ہے اور پتھروں پر سے گھسٹتا ہوا جا رہا ہے اور کہہ رہا ہے: "اے اللہ کے رسول! ہم تو ہنسی مذاق اور تفریح کر رہے تھے"۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے جا رہے تھے: "کیا تم اللہ، اس کی آیتوں اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مذاق کر رہے تھے"۔[2]

استہزاء کا معنیٰ و مفہوم :

اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر طعنہ زنی کرنا، اس کا تمسخر اڑانا، اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر طعنہ زنی اور ان کا تمسخر اڑانا، یا دین و شعائرِ دین پر طعنہ زنی و عیب جوئی

کرنا اس کا تمسخر اڑانا استہزاء کہلاتا ہے"۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس رذالت سے محفوظ فرمائے۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "سخریہ واستہزاء سے مراد تضحیک، استخفاف اور تحقیر ہے۔ نیز عیب ونقائص اس انداز سے بیان کرنا کہ جس سے مذاق اڑے، ہنسا جائے، یہ تضحیک وتحقیر کبھی قول وفعل کی شکل میں ہوتی ہے۔ اور کبھی اشارہ وکنایہ کی صورت میں بھی"۔] 3[

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگر کسی نام کی لغتِ عرب میں تعریف موجود نہ ہو جیسا زمین، آسمان، بحر، شمس، قمر کے نام ہیں، اور نہ ہی اس کی تعریف شرعی اصطلاح میں موجود ہو جیسے صلوٰۃ، زکاۃ، حج، ایمان، کفر کے الفاظ ہیں تو ایسے لفظ کی تعریف متعین کرنے کیلئے عرف کو مدّ نظر رکھا جاتا ہے۔ جیسے قبض (کسی چیز کو قبضہ میں لینا، حرز، بیع، رھن، کِری (کرایہ)، وغیرہ کے الفاظ ہیں (جن کی تعریف عرف کی رو سے متعین ہوتی ہے)۔ اسی طرح تکلیف، گالم گلوچ، سب وشتم میں عرف کی طرف رجوع کیا جائے گا، لہٰذا جن الفاظ وکنایات وافعال کو اہل عرف گالی، عیب جوئی، اور طعنہ زنی شمار کرتے ہیں تو وہ استہزا شمار ہوگا وگرنہ نہیں۔ لہٰذا اسی طرح اگر کوئی لفظ یا گالی غیر نبی کو دی گئی جس کی بنا پر کسی نہ کسی رو سے دینے والے پر کوئی حد یا تعزیر متعین ہوتی ہو وہ الفاظ اگر نبی کیلئے الفاظ استعمال کئے جائیں تو سب وشتم شمار ہوں گے"۔] 4[

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ سب وشتم استہزاء وتمسخر کی کوئی ایک جامع مانع تعریف نہایت مشکل کام ہے لہٰذا اس باب میں ضابطہ یہ ہے کہ جو قول، فعل، اور حرکت اہل عرف کے ہاں

تنقیص، استہزاء اور گالی شمار ہوتی ہو وہ گالی واستہزاء ہی شمار ہوگا۔ اور عرف کی تفسیر ہی اس کی تعریف ہوگی۔

الغرض استہزاو تمسخر کا مطلوب ومفہوم یہ ہے کہ: 'اظہار کل عقیدۃ، أو فعل، أو قول قصدا، یدلّ علی الطعن في الدین، والاستخفاف بہ، والاستھانۃ باللہ تبارک وتعالی ورسلہ علیھم الصلاۃ والسلام].5[

' "کوئی بھی ایسا عقیدہ اپنانا، یا ایسے قول وفعل کا اظہار کرنا جس میں دین پر طعنہ زنی ہو، اس کا استخفاف ہو، اور اللہ تبارک وتعالیٰ یا اس کے رسولوں علیہم الصلاۃ والتسلیم کی تحقیر کی گئی ہو استہزاء کہلاتا ہے"۔

نوٹ: مذکورہ بالا تعریف میں قصداً کا لفظ آیا ہے جس پر جمہور علماء معترض ہیں بلکہ استخفاف اور تحقیر چاہے قصداً ہو یا مذاقاً دونوں صورتوں میں کفریہ فعل ہے۔

شیخ سلیمان بن عبد اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "جس شخص نے بھی اللہ، یا اس کی کتاب، یا اس کے رسول یا اس کے دین کا مذاق اڑایا چاہے اس کا یہ فعل ازراہ تفنن اور مذاق ہی ہو اور اس نے استہزاء کا قصد نہ کیا ہو تو اہل علم کا اجماع ہے کہ وہ کافر ہو جائے گا"۔]6[

استہزاء کی جملہ صورتیں:

شعائر اسلام کو ھدف تنقید اور تنقیص بنانا:

افسوس ناک امر یہ ہے جو کام یہودیوں اور منافقوں کا ہوا کرتا تھا اور ہے وہی کام خود کو مسلمان کہلانے والوں میں آتے جا رہے ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، فرشتے، جنت، حوریں، دوزخ، اللہ کے عذاب، قرآنی آیات، احادیثِ نبویہ، دینی کتابوں، دینی شَعائر، عمامہ، داڑھی، مسجد، مدرسے، دیندار آدمی، دینی لباس، دینی جملے، مقدس

کلمات الغرض وہ کونسی مذہبی چیز ہے کہ جس کا اِس زمانے میں کھلے عام فلموں، ڈراموں، خصوصاً مزاحیہ ڈراموں، عام بول چال، دوستوں کی مجلسوں، دنیاوی تقریروں، ہنسی مذاق کی نشستوں

اور باہمی گپ شپ میں مذاق نہیں اُڑایا جاتا!؟۔ اور یہ مذاق اڑانے والے کوئی غیر نہیں بلکہ خود مسلمان ہیں۔ خود کو مسلمان کہنے والے داڑھی، عمامہ، ٹخنوں سے اونچی شلوار رکھنے اور مذہبی حُلیے سے نفرت کرتے ہیں، اور اسے کراہت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور کئی مقامات اور دفاتر میں تو یہاں تک مشاہدہ کیا گیا ہے کہ وہاں السلام علیکم کہنا بھی لوگوں کو انتہائی ناگوار گزرتا ہے، آذان سن کر تکلیف ہوتی ہے۔ قرآن وحدیث کی باتیں انہیں پرانی باتیں لگتی ہیں۔ یقیناً یہ انتہائی قبیح اور برا فعل ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

**وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ﴿٧﴾ يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا ۖ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٨﴾ وَإِذَا عَلِمَ مِنْ آيَاتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٩﴾**

**سورہ الجاثیہ آیت نمبر 7 تا 9**

ترجمہ: ”ویل‘ اور افسوس ہے ہر ایک جھوٹے گنہگار پر۔ جو آیتیں اللہ کی اپنے سامنے پڑھی جاتی ہوئی سنے پھر بھی غرور کرتا ہوا اس طرح اڑا رہے کہ گویا سنی ہی نہیں تو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی خبر (پہنچا) دیجئے۔ وہ جب ہماری آیتوں میں سے کسی آیت کی خبر پالیتا ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے یہی لوگ ہیں جن کے لئے رسوائی کی مار ہے“۔

لطیفوں میں دینی شعائر کا استعمال:

موجودہ دور میں استہزاء ومذاق کی صورتوں میں یہ صورت بھی بہت عام دیکھی گئی ہے کہ لوگ بے دریغ جنت وجہنم اور فرشتوں کے حوالے سے لطیفے بناتے، سناتے اور لوگوں میں انہیں شیئر کرتے ہیں یہ بھی دین سے استہزاء ہے۔ جس میں سے ایک

لطیفہ بطور مثال یہ مقولہ سامنے رکھتے ہوئے کہ "نقلِکفر کفر نہ باشد" یہاں ذکر کر رہے ہیں۔ کسی احمق نے یہ عام کیا کہ جہنم میں باقی سب قوموں کے اوپر داروغہ مسلط تھے ان میں سے اگر کوئی نکلنے کی کوشش کرتا تو وہ داروغہ انہیں اندر دھکیل دیتا۔ جبکہ جہاں پاکستانی قوم تھی وہاں کوئی داروغہ نہیں تھا کسی نے پوچھا تو جواب دیا گیا کہ پاکستانی دراصل ٹانگ کھینچنے کے ماہر ہیں اس لئے ان میں سے اگر کوئی اوپر نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے دوسرے ساتھی اس کی ٹانگ کھینچ کر اسے دوبارہ جہنم میں گرا دیتے ہیں اس لئے پاکستانیوں کے ٹھکانے پر داروغہ کی ضرورت نہیں"۔ والعیاذ باللہ۔

جہنم جیسے ہولناک مقام کو طنز و مزاح میں لاکر اس کی ہیبت کو کم کرنے کی پوری کوشش کی گئی حالانکہ جہنم کی صفات اگر کوئی بندہ قرآن مجید میں پڑھ لے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "مارأیت مثل النار نام ھاربھا"۔

جیسا "میں نے جہنم جیسی خطرناک جگہ نہیں دیکھی کہ جس سے بھاگنے والا سویا رہے"۔

جہنم جیسی خطرناک جگہ سے نکلنا اللہ کی مشیئت کے بغیر محال ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہکی جان ہے جہنم کی گہرائی ستر سال کی مسافت کے برابر ہے"۔] 7[

جہنم اللہ تعالیٰ کا سخت ترین عذاب ہے۔ اس لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز میں اللہ تعالیٰ سے جہنم کے عذاب کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

اور جن جن سورتوں میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا تذکرہ ہے ان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "مجھے سورت ہود، واقعہ، مرسلات، عَمَّ یَتَسَائَلُونَ اور اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ نے بوڑھا کر دیا ہے"۔] 8[

ضرب الامثال اور محاوروں میں استہزائیہ جملوں کا استعمال :

اسی طرح بہت سے محاروں میں سے ایسے محاورے بھی ہیں جن میں شعائرِ اسلام کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ جیسا کہ عموماً لوگ یہ مثال بیان کرتے ہیں کہ بھائی فلاں شخص تو "احمقوں کی جنت میں رہتا ہے"!۔ والعیاذ باللہ۔

جنت جیسی عظیم نعمت جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مارأیت مثل الجنۃ نام طالبھا"۔

' 'میں نے جنت جیسی عظیم نعمت نہیں دیکھی جسے حاصل کرنے والا سویا رہے "۔

اس نعمت کو احمقوں کی طرف منسوب کرنا کتنی بڑی جارت ہے۔ ایسا مقام جو انبیاء ،صدیقین، شہداء، صالحین کا ٹھکانہ ہے۔ اس سے یہ پیغام ملتا ہے کہ اللہ کی جنت کے علاوہ احمقوں کیلئے یا احمقوں کی بھی کوئی جنت ہے۔

ہر مسلمان کو یہ چیز بخوبی سمجھ لینی چاہئے کہ جنت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور اس کے حقدار اللہ کے نیک بندے ہیں۔ جنت جیسی عظیم نعمت کو احمقوں سے منسوب کرنا بہت بڑی حماقت اور دین سے بہت بڑا مذاق ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

لکھے مُوسیٰ پڑھے خُدا (کہاوت)

یہ کہاوت اس موقع پر بولی جاتی ہے جب کسی شخص کی لکھی ہوئی خراب تحریر صاف پڑھی نہ جارہی ہو۔ اب پتہ نہیں نالائق لوگوں کی خراب لکھائی کا تعلّق سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جوڑنے کا مطلب اور مقصد کیا تھا؟

وضاحت :

یہ کہاوت جس طرح بولی اور لکھی جاتی ہے ایسے نہیں بلکہ اصل کہاوت اس طرح ہے: "لکھے مُو (بال) سا، پڑھے خود آ۔" یعنی جو شخص بال کی طرح باریک لکھتا ہے کہ دُوسروں کے لیے اسے پڑھنا دُشوار ہو تو اسے خود ہی آ کر پڑھے، کوئی اور تو اسے پڑھنے اور سمجھنے سے رہا۔ تعجب ہے کہ اُردو کی بڑی بڑی لُغات اور قواعد کی کُتب میں یہ کہاوت عنوان کے مطابق غلط طور پر لکھی ہوئی پائی گئی ہے، جس سے آپ علم کی نشر واشاعت کے ان نام نہاد مدعیوں اور ذمہ داروں کی علمی سطح کا اندازہ بخوبی کر سکتے ہیں۔

صلواتیں سُنانا: (محاورہ)

صلاۃ کا معنی اور مفہوم ہے: برکتیں اور رحمتیں، جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہوں۔ جس کی جمع صلوات ہے اور اس کے معانی درود، دُعا اور نماز کے بھی ہیں (مگر اردو محاورے میں اسے گالی اور دُشنام کے معنٰی میں استعمال کیا جاتا ہے. لہٰذا "صلواتیں سُنانا" کا مطلب ٹھہرا "گالیاں دینا، بُرا بھلا کہنا"۔

ایک اسلامی شعیرہ کے الفاظ کو کن گمراہ کن غلیظ معانی کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ والعیاذ باللہ

نمازیں بخشوانے گئے اور روزے گلے پڑے: (کہاوت)

مفہوم "ایک کام سے جان چھُڑانے گئے تھے اور دوسری مصیبت گلے پڑ گئی۔"

اِسلام کی بُنیادی عبادات کے متعلق ایسا گُستاخانہ تصور اور طرز تکلّم بہت بڑی جارت کے زُمرے میں آتا ہے، جو ہمارے دین کے ان دو ارکان کا مذاق اُڑانے کے مترادف ہے۔

خُدا واسطے کا بَیر: (محاورہ)

جس کا مطلب کچھ اس طرح ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے خواہ مخواہ رنجیدہ خاطر ہو، جس کی کوئی ظاہری اور معقول وجہ بھی نہ ہو تو کہا جاتا ہے کہ "فلاں کو فلاں کے ساتھ تو خُدا واسطے کا بیر ہے۔"

یعنی شریعت کی اصطلاح حب فی اللہ اور البغض فی اللہ کو کس طرح باہمی چپقلش اور عناد میں بطور محاورہ استعمال کیا گیا اور یہ احساس بھی نہ رہا کہ اللہ کیلئے بیر کون رکھتا ہے اور کس لئے رکھا جاتا ہے اور اس کے فوائد و ثمرات کیا ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو دین حنیف کی سمجھ عطا فرمائے۔

مُوسیٰ بھاگا گور سے اور آگے گور کھڑی: (کہاوت)

' 'یعنی موسیٰ موت سے بھاگے اور موت آگے کھڑی تھی"۔

ملاحظہ کیجئے کہ سیدنا مُوسیٰ علیہ السلام کو کیسے ظاہر کیا گیا کہ وہ موت سے اتنے خوف زدہ اور لرزہ براندام تھے کہ اس فنا ہو جانے والی دُنیا میں زندہ رہنے کی خاطر موت سے چھُپتے اور بھاگتے پھرے مگر موت نے پھر بھی اُنھیں آلیا؟] 9[

اس کہاوت میں کیسے اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ رسول جن کا شمار 'اولوالعزم مِنَ الرسل' میں ہوتا ہے انہیں موت سے خائف اور جان بچاتے بھاگنے کا تصور دیا۔ والعیاذ باللہ۔

تمام انبیاء ورسولوں کے تقدس کا لحاظ ہر مسلمان کا فرض ہے۔

استہزاء اور مذاق کرنے کا شرعی حکم

استہزاء و مذاق کے حکم کے حوالے سے چند بنیادی امور ملحوظ خاطر رکھنے ضروری ہیں:

اول: دین سے مذاق ایک بہت ہی بڑا جرم اور اللہ تعالیٰ کی حدود کی پامالی ہے۔ اور یہ عمل اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کو ایذا دینے کے مترادف ہے۔ جس کی سزا بہت سخت متعین ہے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿٥٧﴾

الاحزاب: 57

ترجمہ: "جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذاء دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لئے نہایت رسوا کن عذاب ہے"۔

امام ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "نص شرعی سے یہ امر ثابت ہے کہ جس نے بھی اللہ تعالیٰ سے، یا فرشتوں میں سے کسی فرشتے، یا انبیاء میں سے کسی نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن کریم کی کسی آیت یا فرائض دین میں سے کسی فریضہ کا مذاق اڑایا استہزا اور تمسخر کیا بعد اس کے کہ حجت و دلیل اس تک پہنچ چکی تھی تو وہ شخص کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے"۔] 10[

دوم: دین سے مذاق میں ہر وہ قول و فعل اور اشارہ شامل ہے جس سے دین پر طعن زنی ہو، اس کا استخفاف اور تحقیر کی جائے۔

جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

الْعُيُوبِ وَالنَّقَائِصِ، عَلَى وَجْهٍ يُضْحَكُ مِنْهُ، وَقَدْ يَكُونُ ذَلِكَ بِالْمُحَاكَاةِ فِي الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ، وَقَدْ يَكُونُ بِالْإِشَارَةِ وَالْإِيمَاءِ][11]'وَمَعْنَى السُّخْرِيَةِ: الِاسْتِهَانَةُ، وَالتَّحْقِيرُ، وَالتَّنْبِيهُ عَلَى

احیاء علوم الدین۔ 3/131 بحوالہ الاستھزاء بالدین أحکامہ و آثارہ۔ ص 79

' 'سخریہ واستہزاء سے مراد تضحیک، استخفاف اور تحقیر ہے۔ نیز عیب ونقائص اس انداز سے بیان کرنا کہ جس سے مذاق اڑے ہنسا جائے، یہ تضحیک و تحقیر کبھی قول و فعل کی شکل میں ہوتی ہے۔ اور کبھی اشارہ و کنایہ کی صورت میں بھی"۔

سوم: اگر کوئی قول و فعل استخفاف، تحقیر اور تنقیص و تمسخر پر دلالت نہیں کرتا تو یہ استہزاء ایسا نہیں جو کہ انسان کو ملتِ اسلامیہ سے خارج کر دے۔

لہٰذا اس سے یہ صورت واضح ہوئی کہ استہزاء کبھی معصیت اور گناہ کے زمرے میں آتا ہے اور کفر کے درجہ کو نہیں پہنچتا جیسا کہ کوئی شخص کسی دیندار شخص کا مذاق اس کی ذاتی حیثیت سے اڑائے نہ کہ اس کی دینداری کی وجہ سے۔

چہارم: ایک مسلمان کی بحیثیت مسلمان ایک بہت بڑی واجبی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اگر کسی شخص کو دین پر طعنہ زنی کرتے اور ٹھٹھ ومذاق بناتے پائے تو اس شخص کی مذمت کی جائے اور اگر یہ چیز اس کی طاقت وسعت سے باہر ہے یا مسلسل تنبیہ اور اصلاح کے باوجود مذاق کرنے والا اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے تو اس شخص کو چاہئے کہ وہ جگہ چھوڑ دے جس جگہ وہ مذاق کرنے والا موجود ہو۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

**وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا ﴿١٤٠﴾**

النساء:140

ترجمہ: ”اور اللہ تمہارے پاس اپنی کتاب میں یہ حکم اتار چکا ہے کہ تم جب کسی مجلس والوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے اور مذاق اڑاتے ہوئے سنو تو اس مجمع میں ان کے ساتھ نہ بیٹھو! جب تک کہ وہ اس کے علاوہ اور باتیں نہ کرنے لگیں (ورنہ) تم بھی اس وقت انہی جیسے ہو، یقیناً اللہ تعالیٰ تمام کافروں اور سب منافقین کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے“۔

اور اگر آپ اس شخص کی باتوں سے محظوظ ہوئے تو گناہ میں برابر کے شریک ہوں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: [إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ]۔ (ورنہ) تم بھی انہی جیسے ہو۔

علامہ ابن باز رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ: کیا جو شخص داڑھی یا کپڑے کے ٹخنے سے اونچا رکھنے کا مذاق اڑاتا ہے کیا یہ فعل کفر ہے؟

آپ نے جواباً فرمایا: ”اس کا حکم نوعیت ونیت کے حساب سے مختلف ہے۔

اس کا مقصد اگر اس سے دین کا مذاق اڑانا تھا تو بلاشک وریب یہ ارتداد ہے فرمان باری تعالیٰ ہے:

قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ

سورہ التوبہ آیت نمبر 65

ترجمہ: "کہہ دیجئے کہ اللہ اس کی آیتیں اور اس کا رسول ہی تمہارے ہنسی مذاق کے لئے رہ گئے ہیں۔

تم بہانے نہ بناؤ یقیناً تم اپنے ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے"۔

اور اگر اس کا مقصد محض اس شخص کا مذاق اڑانا تھا کہ وہ داڑھی رکھ کر اور سنت رسول پر عمل کر کے بھی دیگر منکرات وبرائیوں سے خود کو نہیں بچا رہا، تو اس شخص کا مقصد دین کا مذاق اڑانا نہیں بلکہ دین کی چند جزءیات پر سختی سے کاربند ہونا اور چند میں انتہائی کوتاہی کرنے کی وجہ سے اس شخص کو مذاق کا نشانہ بنانا تھا تو یہ ارتداد نہیں بلکہ اس کا حکم فسق شمار ہوگا۔

پنجم: استہزاء چاہے قصداً ہو یا ازراہ مذاق و تفنن دونوں صورتوں میں کفریہ عمل ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مذاق کو بطور عذر قبول نہیں کیا بلکہ ایسا شخص سزا کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ کیا آپ نے یہ ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجبوری واکراہ کی صورت میں کلمہ کفر کہنے والے کا دل اگر ایمان پر مطمئن تھا تو اس کا عذر قبول کیا، لیکن مذاق کرنے والوں کا عذر قبول نہیں کیا بلکہ فرمایا:

وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ﴿٦٥﴾ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ إِن نَّعْفُ عَن طَائِفَةٍ مِّنكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٦٦﴾

سورہ التوبہ آیت نمبر 65تا66

’’اگر آپ ان سے پوچھیں تو صاف کہہ دیں گے کہ ہم تو یونہی آپس میں ہنس بول رہے تھے۔ کہہ دیجئے کہ اللہ، اس کی آیتیں اور اس کا رسول ہی تمہارے ہنسی مذاق کے لئے رہ گئے ہیں۔ تم بہانے نہ بناؤ یقیناً تم اپنے ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے۔۔۔‘‘

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے لاعلمی، جہالت اور انجانے میں گناہ کرنے والے کو ناقابل مؤاخذہ قرار دیا۔ (لیکن مذاق کرنے والے کا عذر کسی صورت بھی قبول نہیں کیا)۔]12[

اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان سے مذاق کرنے کا انجام :

ذیل میں مستہزئین کے حوالے سے چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں کہ اللہ کے رسول اور اس کے فرامین کا تمسخر اڑانے والے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح کے عبرتناک انجام سے دوچار کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑانے والوں کا عبرتناک انجام:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسر اور قصریٰ دونوں کی طرف اپنے خطوط بھیجے کہ وہ اسلام کو قبول کر لیں دونوں نے اسلام قبول نہیں کیا لیکن ان میں سے قیصر روم نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کی تکریم اور عزت کی اور خط لانے والے کی خاطر داری اور تکریم کی تو اس کی بادشاہت باقی رہی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”فيقال: إن الملك باق في ذريته إلى اليوم“، ولا يزال الملك يتوارث في بعض بلادهم.“

’’کہا جاتا ہے کہ بادشاہت آج بھی قیصر کے خاندان میں باقی اور جاری ہے اور ابھی تک بعض علاقوں میں ان کی جانشینی پشت در پشت قائم ہے“۔

جبکہ کسریٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کو پھاڑ ڈالا اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑایا جس کے انجام میں اللہ تعالیٰ نے اس کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور اس جہانِ فانی میں سلطنت کسروی کا کوئی وجود باقی نہ رہا۔ درحقیقت یہی مطلب ہے اس آیت کا کہ {إن شانئک ھو الأبتر}[الکوثر:3]، "یقیناً تیرا دشمن ہی لاوارث اور بے نام ونشان ہے"۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑانے والوں کی نسلیں ختم ہو جاتی ہیں، صفحہ ہستی سے ان کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "ایک نصرانی اسلام لایا اور اس نے سورت بقرہ اور سورت آل عمران پڑھی پھر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کاتبِ وحی مقرر ہو گیا اس کے بعد پھر وہ مرتد ہو کر نصرانی ہو گیا اور مشرکوں سے جا ملا وہ کہا کرتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا میں نے ان کو لکھ دیا ہے پھر اس کو اللہ تعالیٰ نے موت دی تو لوگوں نے اس کو دفن کر دیا جب صبح کو دیکھا گیا تو زمین نے اس کی لاش کو باہر پھینک دیا تھا لوگوں نے کہا یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھیوں کا فعل ہے چونکہ ان کے ہاں سے بھاگ آیا تھا اس لئے انہوں نے اس کی قبر کھود ڈالی چنانچہ ان لوگوں نے اس کو دوبارہ حتی الامکان بہت گہرائی میں دفن کیا۔ دوسری صبح بھی اس کی لاش کو جب زمین نے باہر پھینک دیا تو لوگوں نے کہا یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اصحاب کا فعل ہے کیونکہ وہ بھاگ آیا تھا پھر انہوں نے جتنا گہرا کھود سکتے تھے کھود کر اس کی لاش کو دفن کر دیا لیکن تیسری صبح بھی جب زمین نے اس کی لاش کو باہر پھینک دیا تب لوگوں نے سمجھا کہ یہ بات آدمیوں کی طرف سے نہیں تب انہوں نے اسے یوں ہی پڑا رہنے دیا"۔[13]

اسی طرح آپ قریش کے ان سرداروں کا انجام سیرت و تاریخ کی کتابوں میں پڑھ لیں خود اندازہ ہو گا کہ مستہزئین میں اللہ تعالیٰ کی کیا سنت اور کیا طریقہ رہا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا مذاق اڑانے والوں کی چند مثالیں:

پہلی مثال: سیدنا ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: 'أما یخشی أحدکم، أو ألا یخشی أحدکم إذا رفع رأسہ قبل الإمام أن یجعل اللہ -عزوجل- رأسہ رأس حمار، أو یجعل صورتہ صورۃ حمار]' 14[

ترجمہ: "آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی جو اپنا سر امام سے پہلے اٹھا لیتا ہے اس بات کا خوف نہیں کرتا کہ اللہ اس کے سر کو گدھے کا سا سر بنا دے یا اللہ اس کی صورت گدھے کی سی صورت بنا دے"۔

ایک محدث بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے دمشق کا رخت سفر باندھا تا کہ وہاں کے مشہور محدث سے علم حدیث حاصل کر سکیں۔ کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ وہ شیخ حدیث بیان کر رہے ہیں لیکن چہرہ ڈھانپا ہوا ہے جس وجہ سے ان چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کہتے ہیں جب میں نے ایک لمبا عرصہ اس محدث کے ساتھ گذار لیا اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ میں حدیث کے حصول میں بہت زیادہ حریص ہوں تو اس شیخ نے اپنے چہرہ کا پردہ ہٹا دیا کہتے ہیں کیا دیکھتا ہوں کہ ان کا چہرہ گدھے کا چہرہ ہے۔ اس پر انہوں نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ میرے بیٹے نماز کے دوران امام سے سبقت لے جانے سے بچ کر رہنا۔ کیونکہ میں نے جب یہ حدیث پڑھی یعنی سیدنا ابو ھریرۃ والی راوایت جو اوپر گذری ہے۔ تو میں نے کہا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی انسان کا چہرہ گدھے کا بن جائے اور سوچا کہ کیوں نہ تجربہ کیا جائے! کہتے ہیں اسی تجربے کیلے میں نے سجدہ میں

امام سے پہلے سر اٹھا لیا تو میرا چہرہ ایسا بن گیا جیسا تو دیکھ رہا ہے یعنی گدھے کا ]"15[

دوسری مثال: کثیر بن قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں دمشق کی مسجد میں سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا تو ایک شخص آیا اور کہنے لگا اے ابادرداء میں آپ کے پاس مدینہ منورہ سے تشریف لایا ہوں ایک حدیث سننے کیلئے جس کی مجھے خبر ملی ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں میں اس کے علاوہ کسی اور مقصد کیلئے نہیں آیا تو ابو درداء فرمانے لگے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ: 'من سلک طریقًا یطلب فیه علمًا، سلک الله به طریقًا من طرق الجنة، وإن الملائکة لتضع أجنحتها رضًا لطالب العلم]'16[

ترجمہ: "میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص طلب علم کے لئے کسی راستے میں چلتا ہے اللہ اسے جنت کے راستے پر چلا دیتا ہے اور فرشتے اس طالب علم کی خوشنودی کے لئے اپنے پر بچھا دیتے ہیں ---"

خطیب بغدادی سلیمان بن احمد بن ایوب الطبرانی کے طریق سے نقل کرتے ہیں انہوں نے فرمایا: میں نے ابا یحیٰ زکریا الساجی سے سنا وہ کہہ رہے تھ کہ "ہم بصرہ کی گلیوں میں کسی ایک محدث کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ہم تیز تیز چل رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک مسخرہ قسم کا (ماجن) شخص بھی تھا جو غیر دیندار تھا تھا وہ ازراہ مذاق کہنے لگا کہ "اپنے پاؤں کو فرشتوں کے پروں سے اٹھا کر چلو کہیں انہیں توڑ نہ دو!! فرماتے ہیں یہ کہنا تھا کہ وہ شخص وہیں اکڑ گیا اپنا ایک قدم آگے نہ اٹھا سکا یہاں تک کہ اس کی ٹانگیں سوکھ (فالج زدہ ہو) گئیں اور وہ زمین پر گر پڑا"۔]17[

حافظ عبد القادر الرہاوی بیان کرتے ہیں کہ "اس حکایت کی سند ایسی ہے جیسا کسی نے یہ چیز اپنے ہاتھوں سے لی، یا اپنی آنکھوں سے دیکھی کیونکہ اس کے راوی اعلام ہیں اور اس کو بیان کرنے والا امام (فی علم الحدیث) ہے]' 18[

تیسری مثال: سیدنا ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

**'من اشترى شاة مصراة فلينقلب بها فليحلبها، فإن رضي حلابها أمسكها، وإلا ردها ومعها صاع من تمر]'19[**

ترجمہ: "رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا جس نے دودھ روکے ہوئے بکری خریدی پھر لے جا کر اس کا دودھ نکالا پس اگر وہ اس کے دودھ سے راضی ہو تو رکھ لے ورنہ واپس کر دے اور اس کے ساتھ ایک صاع کھجور بھی دے"۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جو کہ قاضی ابی الطیب الطبری سے منقول ہے فرماتے ہیں: "ہم بغداد کی جامع مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارے پاس ایک خراسانی شخص آیا اور مصراۃ کا مسئلہ دریافت کیا ہم نے اسے جواب دیا اور مسئلہ مذکورہ میں سیدنا ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے استدلال کیا۔ تو اس شخص نے سیدنا ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر طعن کیا اس کا یہ طعن کرنا تھا کہ آسمان سے ایک سانپ گرا جو مجلس میں دیگر لوگوں کو کراس کرتے ہوئے اس خراسانی شخص کے پاس آیا اسے ڈسا جس سے اس کی وہیں موت واقع ہو گئی۔] 20[

عہد رسالت کا ایک واقعہ:

**عَنْ عِكْرِمَةَ بْنِ عَمَّارٍ حَدَّثَنِي إِيَاسُ بْنُ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ أَنَّ أَبَاهُ حَدَّثَهُ أَنَّ رَجُلًا أَكَلَ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشِمَالِهِ فَقَالَ كُلْ بِيَمِينِكَ قَالَ لَا أَسْتَطِيعُ قَالَ لَا اسْتَطَعْتَ مَا مَنَعَهُ إِلَّا الْكِبْرُ قَالَ فَمَا رَفَعَهَا إِلَى فِيهِ۔"**

**[21]صحيح المسلم: كتاب الأشربة۔ باب آداب الطعام والشراب وأحكامهما**

ترجمہ:"عکرمہ بن عمار، جناب ایاس بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے باپ نے ان سے بیان کیا کہ ایک آدمی نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس اپنے بائیں ہاتھ سے کھانا کھایا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ تو وہ آدمی کہنے لگا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا (اللہ کرے) تو اسے اٹھا ہی نہ سکے اس آدمی کو سوائے تکبر اور غرور کے اور کسی چیز نے اس طرح کرنے سے نہیں روکا راوی کہتے ہیں کہ (اس دن کے بعد سے) وہ آدمی اپنے ہاتھ کو اپنے منہ تک نہ اٹھا سکا"۔(یعنی اس کا ہاتھ وہیں شل ہو گیا)۔

یہ وہ چڑھتے سورج کی مانند واضح آثار و واقعات ہیں جو اللہ، اس کے رسول، اور اس کے دین کے ساتھ مذاق کرنے والوں سے متعلق منقول ہیں۔ جس میں ان کے بھیانک انجام کا بخوبی تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کو توفیق دے کہ ہم شعائرِ اسلام کی تعظیم بجالائیں، حرمات و مقدسات اسلام کی عزت و تکریم کریں اور کسی بھی صورت ان کی تنقیص و تحقیر کرنے سے خود کو محفوظ رکھیں۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

**قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ**

**الحج: ۳۲**

ترجمہ:"یہ سن لیا اب اور سنو! اللہ کی نشانیوں کی جو عزت و حرمت کرے یہ اس کے دل کی پرہیزگاری کی وجہ سے یہ ہے۔"

**وصلی اللہ علی نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم**

[1]فاضل مدینہ یونیورسٹی

[2]تفسیر طبری، ابن ابی حاتم، حسن لشواھدہ

[3]احیاء علوم الدین۔3/131 بحوالہ الاستھزاء بالدین أحکامہ وآثارہ۔ ص79

[4]الصارم المسلول ص/532

[5] فتح العلام بشرح مرشد الأنام للجرداني ج4/ص،538 بحوالہ الاستھزاء بالدین أحکامہ وآثارہ۔ ص79

[6]تیسیر العزیز الحمید ص617

[7] صحیح مسلم: جلد اول: حدیث نمبر482

[8]جامع ترمذی: جلد دوم: حدیث نمبر1245

[9]ان امثال کیلئے اردو پریس Cretech.net سے استفادہ کیا گیا ہے۔

[10]الفصل في الملل والأهواء والنحل 3/142

[11]احیاء علوم الدین۔3/131 بحوالہ الاستہزاء بالدین أحکامہ وآثارہ۔ ص79

[12]إعلام الموقعين) 3/78(

[13] صحیح بخاری: جلد دوم: حدیث نمبر868

[14] صحيح البخاري رقم:(659)، ومسلم رقم) :427(

[15] فتح الملهم شرح صحيح مسلم(2/64)، وتحفة الأحوذي بشرح جامع الترمذي)3/152(

[16]مسند أحمد(5/196)حديث:(21763)، الترمذي، حديث:(2682)، وأبو داود، حديث:(3643)۔

[17]الرحلة في طلب الحديث للخطيب البغدادي(ص:85) مجموع رسائل الحافظ ابن رجب الحنبلي) 1/26.(

[18]مفتاح دار السعادة ومنشور ولاية العلم والإرادة) 1 /64(

[19] صحیح مسلم: حدیث) 1524(

[20]مجموع الفتاوى) 4/539(

[21] صحیح المسلم: کتاب الأشربۃ۔ باب آداب الطعام والشراب وأحکامھما

مؤلف کی مزید کتب
کا مطالعہ بھی کریں۔
مکتبہ دارالرحیل کراچی 03172134743